جلد ۱۲ شمارہ ۱۲ دسمبر ۲۰۰۰ء رمضان ۱۴۲۱ھ

فہرست

شذرات

روزہ اور جذبات کا ہیجان | محمد بلال | ۲
آیئے، ماضی میں چلیں! | محمد بلال | ۵
امام امین احسن اصلاحی کی یاد میں | محمد اسلم نجمی | ۹

قرآنیات

البیان: البقرہ ۲: ۱۲۶-۱۳۲ (۲۴) | جاوید احمد غامدی | ۱۱

معارف نبوی

خیالات | طالب محسن | ۱۸
غلط سوال | طالب محسن | ۲۱
سوال کا جواب | طالب محسن | ۲۴

دین و دانش

قانون جہاد (۲) | جاوید احمد غامدی | ۲۷
روزہ: قرآن مجید کی روشنی میں | جاوید احمد غامدی/منظور الحسن | ۳۰
مولانا حمید الدین فراہی کا علمی مقام: مشاہیر کی نظر میں | اختر حسین عزمی | ۴۱

یسئلون

تقدیر اور دعا | محمد رفیع مفتی | ۵۳
کافر اور غیر مسلم، وتر، نکاح اور ولی کی رضامندی، حب نبوی، امن اور جنگ، خروج اور اقتدار، مہر کی ادائیگی | طالب محسن | ۵۵

ادبیات

غزل | جاوید احمد غامدی | ۵۹

اشاریہ

ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۰۰ | معظم صفدر | ۶۰

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روزہ اور جذبات کا ہیجان

قصور کے نواحی گاں دھار بوال میں مختار نامی ایک شخص نے سبزی فروش محمد حسین سے سبزی خریدی جو خراب نکلی۔ مختار نے محمد حسین کو سبزی واپس کرنے کے لیے کہا، مگر محمد حسین نہ مانا۔ اس پر دونوں میں تکرار ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد تکرار نے جھگڑے کی صورت اختیار کر لی۔ اسی دوران میں صلح صفائی کرانے کی غرض سے مختار کا بھائی اللہ دتہ آگے بڑھا، مگر محمد حسین نے اپنے بھائیوں اور ایک ساتھی کی مدد سے کلہاڑیوں کے وار کر کے اللہ دتہ کو قتل اور اس کی بیوی کو زخمی کر دیا۔

لاہور، بھاٹی چوک میں ہوٹل کا ایک ملازم ضمیر خان چار پائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ساتھی ملازم محمد ریاض نے اس سے کہا: میں اکیلا کام کر رہا ہوں، چار پائی چھوڑو اور میرے ساتھ کام کرو۔ ضمیر خان نے اٹھنے سے انکار کر دیا، جس پر دونوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جھگڑے نے شدت اختیار کر لی۔ ضمیر خان اپنے جذبات کے ہیجان کو قابو میں نہ رکھ سکا، اس نے ریاض کے نازک حصوں پر اس طرح ٹھوکریں ماریں کہ اس کی حالت غیر ہو گئی۔ پولیس فوری طور پر موقع پر پہنچ گئی۔ ریاض کو ہسپتال لے جایا گیا، لیکن اس نے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔

جذبات کے دریاے ہیجان کے آگے تنکے کی طرح بہ جانے والوں کے یہاں صرف دو واقعات درج کیے گئے ہیں۔ ورنہ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے ہاں چھوٹی سی بات پر تکرار کرنا، تکرار سے جھگڑے پر اتر آنا اور جھگڑے سے لڑائی مار کٹائی، حتیٰ کہ قتل و غارت گری جیسی حرکات کا ارتکاب کر بیٹھنا بہت عام ہے۔ ایسے رویوں پر مبنی کئی واقعات ہیں جو روزانہ اخبارات کے ''جرائم'' کے صفحات سیاہ کرتے ہیں۔

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ایسے واقعات کا ایک سبب یہ ہے کہ ہمارے اندر خود انضباطی (self-control)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کا فقدان ہے۔ ہم اپنے اندر اٹھنے والے شدید جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی زبان اور اعضا کو حدود کے اندر نہیں رکھ پاتے۔

رمضان المبارک کا آغاز ہو چکا ہے۔ ایک پہلو سے دیکھیں تو اس مہینے میں ہمیں ایک سخت قسم کے ڈسپلن کی تربیت دی جاتی ہے۔ کھانا ہمارے سامنے ہوتا ہے، بھوک کا جذبہ ہمارے اندر آگ لگائے ہوئے ہوتا ہے، جی چاہتا ہے بغیر کسی توقف کے کھانا کھا لیا جائے، مگر ہم بھوک کے اس شدید جذبے کو قابو میں رکھتے ہیں اور کھانا کھانے سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے ہی پیاس اور جنس کے معاملات میں اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہیں۔

دوسرے پہلو سے سوچیں، ہم سحری کے وقت نرم اور گرم بستر پر گہری اور میٹھی نیند توڑتے ہیں اور بھوک اور معمول کا وقت نہ ہونے کے باوجود کھانا کھاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک کام کرنے کے لیے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی ہے، مگر ہم وہ کام نہیں کرتے۔ اس طرح دل میں کسی کام کی خواہش نہیں ہوتی، مگر اس کے باوجود ہم وہ کام کرتے ہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اگر ہم رمضان میں صحیح شعور کے ساتھ روزے رکھیں تو اس کا یہ لازمی نتیجہ نکلے گا کہ رمضان کے بعد بھی ہم زندگی کے مختلف معاملات میں اپنے جذبات کے ہیجان کو قابو میں رکھیں، مگر افسوس! ایسا بالعموم نہیں ہوتا۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے قابو ہو جاتے ہیں، اپنے اعضا و جوارح کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں اور دین و شریعت کے حدود کو پھلانگ بیٹھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر روزہ رکھنے کے مقاصد کو پامال کر بیٹھتے ہیں۔

غور کیجیے، سورۂ بقرہ میں روزے کا مقصد بیان کرتے ہوئے عالم کے پروردگار نے فرمایا ہے:

"اے ایمان والو، تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔" (۲: ۱۸۳)

تقویٰ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہم اپنے جذبات کے اظہار پر قابو پائیں تاکہ زندگی کے مختلف معاملات میں خود کو اللہ کے قائم کیے گئے حدود کے اندر رکھ سکیں۔ جب ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا اور قتل و غارت گری کا ارتکاب کرتے ہیں تو در اصل تقویٰ کے منافی طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ سورۂ مائدہ میں ہے:

"اور تم نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو، گناہ اور عدوان میں تعاون نہ کرو۔" (۵: ۲)

اس آیت میں تقویٰ کے تقابل میں عدوان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ عدوان کے معنی اپنے حدود سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ اسی طرح سورۂ فتح میں ہے:

”اس وقت کا خیال کرو جب کفر کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی: جاہلیت کی حمیت۔ تو اللہ نے اپنی طمانیت نازل فرمائی اور اپنے رسول اور ایمان والوں پر ان کو پابند رکھا تقویٰ کی بات کا اور یہ اس کے حق دار اور سزاوار تھے۔“ (۴۸:۲۶)

یہ اس وقت کی بات ہے جب حدیبیہ کے مقام پر کفارِ مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو بیت اللہ کا حج کرنے سے روک دیا تھا۔ اس وقت مسلمان کمزور نہ تھے اور پھر کفار نے مسلمانوں کے ساتھ بہت اہانت انگیز رویہ اختیار کیا تھا۔ اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ بہت دب کر صلح کی، جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس موقع پر مسلمان بہت مشتعل ہو رہے تھے۔ وہ اس صلح پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے، مگر انھوں نے اللہ کی رضا کی خاطر اپنے جذبات کے ہیجان کو قابو میں رکھا، جس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی طمانیت نازل کی، اسے کلمۂ تقویٰ سے تعبیر کیا اور مسلمانوں کی تحسین فرمائی کہ وہ اس کلمے کے حق دار قرار پائے۔

آیئے، اس رمضان میں ہم خدا سے اور اپنے آپ سے یہ عہد کریں کہ اس مہینے میں ہم خود کو حدودِ الٰہی کا پابند رکھنے، عدوان سے بچنے اور جذبات کے ہیجان پر قابو پانے کی جو تربیت حاصل کریں گے اس پر آیندہ زندگی کے مختلف مراحل میں عمل بھی کریں گے۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آیئے، ماضی میں چلیں!

پچھلے دنوں بھارتی جریدے ''انڈیا ٹوڈے'' میں سانحۂ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ شائع ہوئی۔ اس بارے میں ایک پریس کانفرنس میں جنرل پرویز مشرف سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں تجویز کردہ ٹرائل ہوں گے؟ تو انھوں نے کہا: ''نہیں۔ یقیناً نہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے ذمہ دار فوجی ہی نہیں، سیاست دان بھی ہیں۔ اس کیس میں ملوث اکثر وفات پا چکے ہیں۔ ماضی کے اس قصے کو بھول جانا چاہیے۔ یہی ہم سب کے لیے بہتر ہے۔'' جنرل صاحب کی اس بات کے بعد ملک کے باشعور حلقوں کی جانب سے سخت ردِ عمل کا اظہار ہوا۔

بزرگ صحافی ارشاد احمد حقانی نے کہا: ''افراد تو اپنے ماضی کے حادثات اور المیوں کو ''ایک برا خواب'' کہہ کر فراموش کر سکتے ہیں، اقوام ایسا نہیں کر سکتیں اور جن اقوام نے ایسا کیا ہے انھوں نے نقصان اٹھایا ہے۔..... کوئی وجہ نہیں کہ ہم سانحۂ مشرقی پاکستان کو بالکل فراموش کر دیں اور اپنے قومی حافظے سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں، ایسا کرنا خود فریبی ہو گی۔''

کالم نویس جاوید چودھری نے کہا: ''جنرل صاحب، شکست قوموں کا حافظہ ہوتی ہے۔ جو قومیں اپنی شکست، اپنے زخم بھلا دیتی ہیں، وہ کبھی فاتح کا رتبہ نہیں پا سکتیں اور ماضی تو ان چنگاریوں کا دفینہ ہوتا ہے جو دہک کر قوموں کا کل روشن کیا کرتی ہیں۔''

کالم نویس ہارون عدیم نے لکھا: ''کیا تاریخ میں رہنا گناہ یا جرم ہے؟ اور کیا وہ قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جو اپنی تاریخ کو بھول جائیں؟''

باشعور حلقوں کی جانب سے جنرل صاحب کی بات پر تنقید سو فی صد صحیح ہے۔ کسی بھی قوم کے لیے اپنی تاریخ کو بھلانا ناممکن ہے۔ اسی لیے کالم نویس عبد القادر حسن نے پاکستان کے ٹوٹنے کو بھلا دینے کی مذکورہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

حکومتی نصیحت کے حوالے سے لکھا:

”روز کہتا ہوں بھول جاؤں اسے

روز یہ بات بھول جاتا ہوں“

بالکل صحیح۔ اس بات کو بھولنا بھی نہیں چاہیے۔ یہ کوئی بھول جانے والی بات نہیں ہے کہ ایک مسلمان ملک کے ایک حصے کے مسلمان دوسرے حصے کے مسلمانوں سے شدید نفرت کرنے لگے۔ انھوں نے ان سے الگ ہونے کی تحریک کو تحریکِ آزادی کا نام دے دیا۔ ہر سطح پر لبریشن کمیٹیاں تشکیل دے دیں۔ لوٹنے، آگ لگانے اور قتل کرنے کے لیے غیر بنگالی مسلمانوں کے گھروں پر سرخ نشان لگا دیے۔ سات گھروں کو مکینوں سمیت آگ لگا دی۔ پاکستانی پرچم جلا دیا۔ غیر بنگالیوں کی دکانوں کو تباہ کر دیا۔ ہزاروں پنجابی اور بہاری مسلمانوں کے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ بعض لڑکیوں کو قتل کر کے ان کی شرم گاہوں میں بنگلہ دیشی جھنڈے نصب کر دیے۔

یہ کوئی بھول جانے والی بات نہیں ہے کہ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے ایک مرحلے پر بھارتی فوج کا میجر جنرل ناگرا ڈھاکہ کی دہلیز پر آ بیٹھا اور پاکستان کے لیفٹیننٹ جنرل نیازی کو خط لکھا: ”میرے پیارے عبداللہ، میں میرپور پل پر ہوں، اپنا نمائندہ بھیج دو۔“ جنرل نیازی کو یہ خط ۱۶ دسمبر کو ملا۔ ڈھاکہ کے پاکستانی محافظ جنرل جمشید کو میجر جنرل ناگرا کے پاس بھیجتے ہوئے اس کے افسران نے کہا: ”جاؤ، اور جو وہ کہتا ہے، کرو۔“..... اور پھر میجر ناگرا ایک گولی فائر کیے بغیر ڈھاکہ میں داخل ہو گیا..... بھارتی فاتحین کا استقبال کرنے کے لیے ایسٹرن کمانڈ کے پرانے ہیڈ کوارٹر کو جھاڑا پونچھا گیا۔ استقبال کے لیے اس ہیڈ کوارٹر کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ وہاں فرنیچر عمدہ تھا۔

یہ کوئی بھول جانے والی بات نہیں ہے کہ جب بریگیڈیر باقر صدیقی اپنے بھارتی ہم منصب (یعنی بھارتی ایسٹرن کمانڈ کے چیف آف اسٹاف) میجر جنرل جیکب کو لینے ایئرپورٹ گئے تو اس دوران میں جنرل نیازی اپنے ”مہمان“ میجر جنرل ناگرا کی لطیفوں سے تواضع کرتے رہے..... جیکب سقوط کی دستاویز (Instrument Of Surrender) اپنے ساتھ لایا..... جیکب نے یہ کاغذات باقر صدیقی کو دیے جس نے جنرل فرمان کے سامنے رکھ دیے۔ کاغذات میں ”ہندوستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان“ کے الفاظ درج تھے۔ جنرل فرمان نے کہا: یہ ”ہندوستان اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان“ کیا چیز ہے؟ ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اس پر جیکب نے

کہا: ''یہ دستاویز ایسے ہی تیار شدہ دہلی سے آئی ہے۔'' (یعنی مجھے اس میں ردوبدل کا اختیار حاصل نہیں) انڈین ملٹری انٹیلی جنس کا کرنل کھیرا پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ بولا: ''یہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ ہے''۔

——آہ! کس قدر تکلیف دینے والا ہے یہ جملہ: ''یہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کا اندرونی معاملہ ہے۔''——

تھوڑی دیر بعد لیفٹیننٹ جنرل نیازی بھارتی ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کو لینے ڈھاکہ ائرپورٹ گئے۔

یہ کوئی بھول جانے والی بات نہیں ہے کہ جگجیت سنگھ اروڑہ اپنی فتح کی خوشی میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لایا تھا۔ جونہی یہ میاں بیوی ہیلی کاپٹر سے اترے، بنگالی مردوں اور عورتوں نے اس ''نجات دہندہ'' اور اس کی بیوی کا پرجوش استقبال کیا۔ انھیں پھولوں کے ہار پہنائے، گلے لگایا، بوسے دیے اور تشکر بھرے جذبات سے انھیں خوش آمدید کہا۔ جی ہاں، یہ سب کچھ ''پاکستانی'' مسلمانوں نے کیا۔ جنرل نیازی نے بڑھ کر فوجی انداز میں سیلوٹ کیا اور پھر ہاتھ ملایا۔ فاتح اور مفتوح، بنگالی مسلمانوں کی موجودگی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں مفتوح مسلمانوں کے لیے نفرت اور فاتح غیر مسلموں کے لیے احسان مندی کے جذبات تھے۔

یہ کوئی بھول جانے والی بات نہیں ہے کہ نیازی اور اروڑہ ایئرپورٹ سے سیدھے ایک گراؤنڈ میں گئے، جہاں سرِ عام جنرل نیازی سے ہتھیار ڈالوانے کی تقریب منعقد ہوئی۔...... ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھ کر لاکھوں بنگالیوں کے سامنے جنرل نیازی نے سقوطِ مشرقی پاکستان کی دستاویز پر دستخط کیے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا ریوالور نکال کر اروڑہ کو پیش کیا۔ اور یوں سقوطِ ڈھاکہ پر آخری مہر ثبت کر دی۔ اس موقع پر جنرل اروڑہ نے پاکستانی سپاہیوں کے ایک گارڈ آف آنر کا معاینہ کیا جو سقوطِ ڈھاکہ کے چشمِ دید گواہ بریگیڈیر صدیق سالک کے بقول اس بات کی علامت تھا کہ اب وہی ''گارڈ'' ہیں اور وہی ''آنر'' کے مستحق!

یہ سب بھول جانے والی باتیں نہیں ہیں۔ جب تک ہم احساس اور شعور سے بہرہ یاب ہیں کسی حکمران کے حکم کے باوجود یہ باتیں نہیں بھلا سکتے۔

اگر ہم ہر سال ۶ ستمبر کے حوالے سے ماضی میں جا سکتے ہیں۔ ماضی کے قصوں کو یاد کر سکتے ہیں۔ اپنے کارنامے بیان کر سکتے ہیں۔ قوم میں فخر کی نفسیات پیدا کر سکتے ہیں، تو اسی طرح ۱۶ دسمبر کے حوالے سے ماضی میں کیوں نہیں جا سکتے۔ ماضی کے ان قصوں کو یاد کیوں نہیں کر سکتے۔ اپنے جرائم کو بیان کیوں نہیں کر سکتے۔

اپنی حماقتوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے۔ قوم میں حقیقت پسندی کا رویہ پیدا کیوں نہیں کر سکتے۔

اس ماضی میں جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ماضی ہی کے ہو کر رہ جائیں، ہم ذہن کے بجائے حافظے ہی کو استعمال کرتے رہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ماضی کی کوتاہیوں سے سبق حاصل کریں۔ حافظے میں موجود مواد پر ذہن لڑائیں۔ واقعات کے اسباب تلاش کریں۔ ماضی کی شکست سے عبرت پکڑیں اور آیندہ ایسی ذلت سے بچنے کی سعی کریں۔ گویا ماضی میں جانا درحقیقت اپنے حال کی تعمیر کرنا ہے، اپنے مستقبل کی تشکیل کرنا ہے اور ترقی کے منازل طے کرنا ہے۔ غور کیجیے، عالم کے پروردگار نے دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کفارِ مکہ کو ماضی یعنی تاریخ کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر یہ ہدایت فرمائی:

> ”کیا انھوں نے زمین میں سفر نہیں کیا کہ دیکھتے کہ کیسا ہو چکا ہے انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں حالانکہ وہ قوت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ اور آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ اللہ کے قابو سے باہر نکل سکے۔ وہ علم والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔“ (الفاطر ۳۵: ۴۴)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ان آیات میں زمین پر موجود پچھلی اقوام کی بربادی کے آثار دیکھنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ ذرا گہرائی میں اتر کر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ اصل میں ماضی میں جانے ہی کی ترغیب ہے۔ زمین پر بکھرے ہوئے تاریخ کے اوراق پڑھنے ہی کی ترغیب ہے۔ ماضی سے اپنا حال اور مستقبل سنوارنے ہی کی ترغیب ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ ماضی انسانی زندگی کے گزرے ہوئے مردہ لمحات کا نام ہے، مگر ان مردہ لمحات سے بھی زندگی کی رمق، زندگی کی تفہیم اور زندگی کی رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

یہ دسمبر کا مہینا ہے۔ اس مہینے میں ہم ایک عظیم سانحے سے دوچار ہوئے۔ ذلت کے بدنما دھبے ہمارے چہروں پر لگے۔ شکست کے تیر ہمارے سینوں میں چبھے۔ شرمندگی سے سر دشمن کے آگے جُھکے۔ آیئے، ماضی میں چلیں۔ کتابِ تاریخ کے پچھلے اوراق دیکھیں۔ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں۔ اس عظیم سانحے پر غور کریں۔ ان دھبوں کا مشاہدہ کریں۔ ان تیروں پر ذہن لڑائیں۔ ان جھکے ہوئے سروں کے بارے میں سوچیں۔ ان کے اسباب تلاش کریں اور ان اسباب کے خاتمے کے لیے پوری سرگرمی کے ساتھ سعی و جہد کریں۔

—— محمد بلال

امام امین احسن اصلاحی کی یاد میں

پھر دسمبر آن پہنچا۔ گردشِ دوراں نے ایک مرتبہ پھر اس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے، جہاں میں چشمِ تصور سے الاستاذ الامام امین احسن اصلاحی کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوتے دیکھ رہا ہوں، یوں لگتا ہے جیسے وہ اللہ پروردگارِ عالم کے حضور میں حاضری کے لیے خوف ورجا کے عالم میں سوچوں میں گم چلے جا رہے ہوں.... اور اب افقِ ذہن پر یادوں کے چند نقوش کے سوا اور کچھ باقی نہیں۔

الاستاذ الامام نے عمرِ عزیز کے ۹۳ سال اس دنیا میں گزارے۔ زندگی کے آخری ایام بسترِ علالت پر بسر ہوئے۔ فالج جیسے موذی مرض کا شکار ہوئے اور بالآخر اسی حالت میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

مجھے ان کے دروسِ قرآن و حدیث اور نج کی مجالس میں بیسیوں مرتبہ حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہ قرآن کا درس دے رہے ہوتے تو یوں لگتا کہ جیسے ام الکتاب خود بول کر اپنا مدعا بیان کر رہی ہے۔ نج کی مجالس میں مہربان بزرگ، بے تکلف دوست اور مخلص ناصح کے روپ میں سامنے آتے، بات اس پختگی سے کرتے کہ جیسے قدم جما کر بلندی سے نیچے اتر رہے ہوں، اگر کوئی سوال کرتا تو کچھ دیر توقف فرماتے اور پھر جواب دیتے تو یوں لگتا کہ جیسے سوال انھیں پہلے سے معلوم تھا اور جواب ترتیب دینے میں گھنٹوں محنت کی گئی ہے۔

ان کی زندگی کا حاصل اور اصل سرمایہ قرآنِ مجید کی تفسیر "تدبرِ قرآن" ہے۔ اردو زبان میں یہ تفسیر اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے قرآن کا مدعا بیان کرنے میں ایسا دل نشیں، جامع اور عالمانہ اسلوب اختیار کیا کہ بقول غالب صریرِ خامہ کو نوائے سروش بنا دیا۔

علم و فضل اور عقل و دانش کے انتہائی ارفع مقام پر فائز ہونے کے باوجود غرور و تکبر اور فخر و مباہات جیسی چیزیں ان میں نام کو بھی نہ تھیں۔ البتہ بعض مواقع پر جب راجپوتوں والی حمیت غالب آتی تو شعلۂ جوالہ بن جاتے، مگر انھیں سنبھلنے میں دیر نہ لگتی اور جلد ہی گفتگو میں ایسی شیرینی بھر جاتی کہ یوں لگتا جیسے انھیں غصہ آتا

ہی نہیں۔

علم و دانش کے میدان میں اسلاف اور اکابر کی روایت کے سچے پاسبان اور امین تھے۔ وہ سلف کا بے پناہ احترام کرتے، مگر تقلید کی روش سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ ساری زندگی بات کو شخصیات کے پس منظر میں دیکھنے کے بجائے دلائل و براہین کی روشنی میں پرکھا اور سمجھا۔ حق اور حق پر ثابت قدمی میں انھوں نے حیران کن حد تک استقامت کا مظاہرہ کیا۔ دنیا و مافیہا کی پروا کیے بغیر جسے حق سمجھا عمر بھر اس پر قائم رہے۔ اور اگر کبھی ان پر رائے کی غلطی واضح ہو گئی تو رجوع کرنے اور اپنی بات پر نظرِ ثانی کر کے صحیح موقف اختیار کرنے میں لمحوں کی تاخیر بھی گوارا نہ کی۔

دنیوی جاہ و منصب کا حریص ہونا تو کجا، اس سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ امام فراہی نے انھیں جب قرآن پڑھنے کی ترغیب دلائی تو انھوں نے فوراً ایک اخبار کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا۔ کالج میں پروفیسر کی ملازمت اختیار کرنے کی پیش کش ہوئی تو معذرت کر لی۔ اس ملازمت کے لیے سید سلیمان صاحب ندوی نے ان کا نام تجویز کیا تھا۔ اتنی منافع بخش ملازمت سے الاستاذ کے انکار نے سید صاحب کو بھی حیران کر دیا۔

الاستاذ الامام کے مزاج کو حدیثِ رسول سے ایک گونہ مناسبت تھی مگر ان کا اصل لگاؤ قرآنِ مجید سے تھا۔ قرآنِ مجید سے ان کے شغف کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ میں ان کے درس میں حاضر تھا۔ ان دنوں درس فاضلیہ کالونی میں آپا نثار فاطمہ صاحبہ کے گھر ہوتا تھا۔ وہ غالباً سورۂ انعام کا درس دے رہے تھے کہ بولتے ہوئے اچانک رک گئے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد گویا ہوئے: اگر قرآن کی لذت کے علاوہ مجھے اور کوئی بھی نعمت نہ ملی ہوتی تو میرے لیے یہ مشکل نہ تھا کہ میں اسی ایک لذت کے سہارے پوری زندگی گزار دیتا۔

خدا رحمت کند ایں ''بندگانِ'' پاک طینت را

—— محمد اسلم نجمی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۲۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

اور یاد کرو، جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے پروردگار، اِس شہر کو امن کا شہر بنادے[۳۱۰] اور اِس

۳۱۰۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی ذریت کو مکہ میں آباد کیا تو اُس وقت یہ شہر نہ صرف یہ کہ تہذیب و تمدن اور آبادی و زرخیزی سے بالکل محروم تھا، بلکہ وحشی اور خانہ بدوش قبیلوں کی لوٹ مار سے بھی محفوظ نہ تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اسی بنا پر یہ دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس طرح قبول فرمایا کہ اولاً، اس سرزمین میں لڑنا بھڑنا اور جنگ و جدال یک قلم ممنوع قرار دیا۔ ثانیاً، اس کی طرف سفر کے لیے چار مہینے حرام قرار دیے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے گردوپیش میں خطرناک سے خطرناک علاقے بھی ان مہینوں میں بالکل پرامن ہو گئے۔ ثالثاً، اس میں اپنے گھر کو ایسی ہیبت عطا فرمائی کہ اس پر باہر سے اول تو کسی نے حملہ آور ہونے کی جرأت ہی نہیں کی، لیکن اگر کبھی ایسا ہوا تو اس کے باشندوں کی اس طرح مدد کی کہ ان کی معمولی مزاحمت پر آسمان سے ان کے لیے اپنے جنودِ قاہرہ بھیج کر اس کے دشمنوں کو بالکل پامال کر دیا۔

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

کے لوگوں میں سے جو اللہ اور قیامت کو ماننے والے ہوں،[۳۱۱] اُنھیں پیداوار[۳۱۲] کی روزی عطا فرما۔[۳۱۳] (پروردگار نے) فرمایا: اور جو منکر ہیں، (اِن چیزوں سے) چند روز کے لیے فائدہ اٹھانے کی مہلت تو میں اُنھیں بھی دوں گا،[۳۱۴] پھر دوزخ کے عذاب میں پکڑ بلاؤں گا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ۱۲۶

۳۱۱۔ اس سے پہلے بیان ہوا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب امامت کے متعلق پوچھا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں یہ صاف جواب دیا گیا تھا کہ یہ منصب تمھاری اولاد میں سے صرف صالحین کے لیے ہے۔ چنانچہ اسی کے پیشِ نظر تسلیم و رضا کے اس پیکر نے جب رزق کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس میں یہ قید بھی لگا دی کہ میں یہ درخواست صرف اپنی اولاد کے اہلِ ایمان کے لیے کر رہا ہوں۔

۳۱۲۔ اصل میں 'من الثمرات' کے الفاظ آئے ہیں عربی زبان میں 'ثمرات' کا لفظ جس طرح پھلوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح غلہ، جنس، پھل اور اس طرح کی دوسری چیزوں کو شامل کر کے اس سے عام اور وسیع مفہوم میں بھی آتا ہے۔ سیدنا ابراہیم نے یہ دعا چونکہ بدوی زندگی کی بے اطمینانیوں کے مقابلے میں حضری زندگی کے سکون اور اطمینان سے بہرہ مند ہونے کے لیے کی تھی، اس لیے ہم نے اسے یہاں اس کے اسی وسیع مفہوم میں لیا ہے اور اس کا ترجمہ پھلوں کے بجائے پیداوار کے لفظ سے کیا ہے۔

۳۱۳۔ یہ دعا بھی اس طرح پوری ہوئی کہ حج و عمرہ کی وجہ سے لوگوں کا رجوع اس سرزمین کی طرف بہت بڑھ گیا۔ اس سے تجارت اور کاروبار کو فروغ ہوا۔ باہر سے ہر قسم کی چیزیں اس شہر کے بازاروں میں پہنچنے لگیں۔ پھر حرم کی تولیت کے باعث قریش کو ایسی عزت حاصل ہوئی کہ اُن کے قافلے بغیر کسی تعرض کے دوسرے ملکوں میں جانے لگے۔ اس سے گلہ بانی اور شکار ہی پر گزر بسر کرنے والوں کی معیشت میں غیر معمولی تبدیلی آئی۔ چنانچہ ہر طرح کی اجناس اور پھل وغیرہ اس شہر میں فراوانی کے ساتھ میسر ہو گئے۔

۳۱۴۔ سیدنا ابراہیم نے روزی کے لیے ایمان کی جو شرط اپنی دعا میں لگا دی تھی، یہ اس کے متعلق واضح فرمایا ہے کہ امامت اور معیشت کے معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ روزی تو اللہ تعالیٰ اس دنیا

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰھٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَاِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَاَرِنَا

اور یاد کرو، جب ابراہیم اور اسمٰعیل (میرے) اِس گھر کی بنیادیں اٹھارہے تھے۔ (اُس وقت اُن کے لبوں پر التجا تھی کہ) پروردگار، تو ہماری طرف سے (یہ دعا) قبول فرما۔[۳۱۵] اِس میں شبہ نہیں کہ تو ہی سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔[۳۱۶] ۱۲۷

پروردگار، اور ہم دونوں کو تو اپنا فرماں بردار بنا[۳۱۷] اور ہماری اولاد سے بھی اپنی ایک فرماں بردار

میں ماننے والوں کو بھی دیتا ہے اور نہ ماننے والوں کو بھی۔ دینی امامت، البتہ صالحین کے لیے خاص ہے اور وہ ہمیشہ ایمان اور عملِ صالح کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔

۳۱۵۔ اصل میں 'ربنا تقبل منا' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ جملہ، ہمارے نزدیک اس پوری دعا کے لیے بطورِ تمہید ہے جو آگے آرہی ہے، لہٰذا 'تقبل' کا یہ مفعول ہم نے ترجمے میں کھول دیا ہے۔

۳۱۶۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ان دو صفتوں کا حوالہ ہے جن پر اعتماد کر کے بندہ اپنے پروردگار سے دعا کرتا ہے۔ اس میں حصر کا اسلوب بندے کی طرف سے کامل سپردگی اور کامل اعتماد کے اظہار کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

۳۱۷۔ اصل الفاظ ہیں: 'ربنا واجعلنا مسلمین لک' دعا کی ابتدا میں باپ بیٹے دونوں کی طرف سے اپنے مسلم بنائے جانے کی اس التجا سے جو حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں، وہ استاذ امام نے اپنی تفسیر ''تدبرِ قرآن'' میں اس طرح واضح فرمائی ہیں:

> ''ایک تو یہ کہ ایمان و اسلام اور طلبِ خشیت و تقویٰ کی دعاؤں میں انسان سب سے پہلے اپنے آپ کو سامنے رکھے، یہ چیزیں ایسی نہیں جن سے کوئی بھی مستغنی ہو سکے، اگرچہ وہ کتنا ہی عالی مقام ہو۔ دوسری یہ کہ اسلام کے درجات و مراتب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل جیسے مسلم کامل بھی، جن کے ذریعے سے دنیا اسلام کے نام اور اس کی روح سے آشنا ہوئی، اپنے مسلم بنائے جانے کے لیے دعا کرتے تھے۔ تیسری حقیقت جو خاص اس موقع سے تعلق رکھنے والی اور نظمِ کلام کو کھولنے والی ہے، یہ ہے کہ حضرت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ

امت[318] اٹھا اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا[319] اور ہماری توبہ قبول فرما۔[320] اِس میں شبہ نہیں کہ تو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا، (اپنے بندوں پر) رحم فرمانے والا ہے۔ پروردگار، اور اُنھی میں سے تو اُن کے اندر ایک رسول[321] اٹھا جو تیری آیتیں اُنھیں سنائے[322] اور اُنھیں قانون اور

ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تاریخی موقع پر جب کہ وہ اپنے مشن کا مرکز تعمیر کر رہے تھے، اپنے لیے جس چیز کی دعا کی تھی، مسلم بنائے جانے کی تھی نہ کہ یہودی یا نصرانی بنائے جانے کی۔'' (ج ۱ ص ۳۳۸)

۳۱۸۔ اس دعا کے موقع پر سیدنا ابراہیم کے ساتھ ان کی ذریت میں سے صرف اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے، اس لیے بالبداہت واضح ہے کہ یہ انھی کی اولاد سے متعلق تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی دعوت کے نتیجے میں جماعتِ صحابہ کے ظہور سے یہ دعا حرف بہ حرف پوری ہو گئی۔ بائیبل کی کتابِ پیدایش (۲۲: ۱۸) میں فرزند کی قربانی کے بعد یہ الفاظ کہ ''اور تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی''، اسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

۳۱۹۔ اصل الفاظ ہیں: 'ارنا مناسکنا'۔ ان میں 'ارنا' کے معنی 'ہمیں دکھا' کے ہیں۔ سیدنا ابراہیم نے یہ لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ عبادات سے متعلق جو سنن انبیا علیہم السلام نے قائم کی ہیں، ان کی تعلیم بالعموم اس طرح دی گئی کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان پر عمل کر کے رؤیا وغیرہ میں انھیں دکھا دیا۔ 'مناسک' کا لفظ اس آیت میں جمع ہے جس کا واحد 'منسک' ہے۔ اس کے معنی قربانی کے طریقہ کے بھی ہیں اور قربان گاہ کے بھی۔ اسی سے عام ہو کر یہ حج و عمرہ کے تمام مراسم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۳۲۰۔ اصل میں 'تب علینا' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'علیٰ' کا صلہ دلیل ہے کہ رحمت کا مفہوم یہاں متضمن ہے۔ قرآن نے آگے 'انک انت التواب الرحیم' کہہ کر اسے کھول دیا ہے۔

۳۲۱۔ اس دعا میں رسول کا لفظ اہلِ کتاب، بالخصوص یہود کو یہ بتاتا ہے کہ سیدنا ابراہیم نے بنی اسمٰعیل میں جس نبی کی بعثت کے لیے دعا کی تھی، یہ وہی ہیں جن کا تعارف سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی کتابِ استثنا

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٢٩﴾

حکمت [۳۲۳] سکھائے اور (اِس طرح)، اُنھیں پاکیزہ بنائے۔ [۳۲۴] اِس میں شبہ نہیں کہ تو بڑا ہی زبردست

(۱۸: ۱۵) میں 'میری مانند' کے الفاظ سے کرایا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ نبوت کے ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز تھے، لہٰذا ابراہیم علیہ السلام کی دعا بھی ایک صاحبِ رسالت نبی کے لیے تھی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے مطابق ایک رسول کی حیثیت سے مبعوث ہوئے ہیں۔

۳۲۲۔ آیت عربی زبان میں اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جائے۔ قرآن کا ہر جملہ کسی نہ کسی حقیقت کے لیے دلیل و برہان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے لیے آیت کا لفظ اسی رعایت سے اختیار کیا گیا ہے۔ آیتیں سنانے کے لیے اصل میں 'يتلوا عليهم' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اس زور و اختیار کو ظاہر کرتے ہیں جس کے ساتھ اللہ کا رسول اس کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو اس کا فرمان پڑھ کر سناتا ہے اور پھر خدا کی عدالت بن کر اس کا فیصلہ ان پر نافذ کر دیتا ہے۔

۳۲۳۔ اصل میں 'يعلمهم الكتاب والحكمة' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'الکتاب' قرآن کی زبان میں جس طرح خط اور کتاب کے معنی میں آتا ہے، اسی طرح قانون کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور 'الحکمۃ' جب اس طرح عطف ہو کر آتے ہیں تو 'الکتاب' سے شریعت اور 'الحکمۃ' سے دین کی حقیقت اور ایمان و اخلاق کے مباحث مراد ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورت ہے اور اس سے آنے والے پیغمبر کی یہ خصوصیت واضح ہوتی ہے کہ اس کی دعوت قانون و حکمت دونوں کی جامع ہو گی۔ اس کے لیے 'يعلمهم' کا فعل بالکل اسی طرح آیا ہے جس طرح 'الرحمن، علم القرآن' (۵۵: ۱-۲) میں ہے، یعنی ان کے اندر وہ رسول اٹھا جو انھیں قانون و حکمت کا علم دے۔

۳۲۴۔ اس مفہوم کے لیے عربی زبان کا جو لفظ قرآن نے اختیار کیا ہے، وہ تزکیہ ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کو آیشوں سے پاک کرنے کے بھی ہیں اور نشو و نما دینے کے بھی۔ انبیا علیہم السلام انسانوں کو جس قانون و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، اس سے یہ دونوں ہی چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ سیدنا ابراہیم کا مدعا یہ ہے کہ آنے والا انھیں وہ قانون اور وہ حکمت سکھائے جس سے ان کا علم و عمل تمام آلایشوں سے پاک ہو کر صحیح سمت میں نشو و نما پانے لگے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو تزکیہ قانون و حکمت سے الگ کوئی چیز نہیں، بلکہ انھی دونوں کا حاصل ہے جسے قرآن

وَمَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّۃِ اِبۡرٰہٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِہَ نَفۡسَہٗ ؕ وَلَقَدِ اصۡطَفَیۡنٰہُ فِی
الدُّنۡیَا ۚ وَاِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذۡ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ
اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾

ہے، بڑی حکمت والا ہے۔[۳۲۵] ۱۲۸-۱۲۹

اور ابراہیم کے دین سے کون ہے جو انحراف کرے، ہاں، وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کر لے۔[۳۲۶] ہم نے اُس کو دنیا میں بھی اپنے لیے خاص کیا،[۳۲۷] اور قیامت میں بھی وہ صالحین میں سے ہو گا۔ (وہی ابراہیم کہ) جب اس کے پروردگار نے اسے حکم دیا کہ اپنے آپ کو حوالے کر دو۔ اُس نے فوراً کہا: میں نے اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کے حوالے کر دیا۔[۳۲۸] ۱۳۰-۱۳۱

نے عربیت کے اسلوب پر بیان کی واؤ سے ان پر عطف کر دیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ دین در حقیقت دو ہی چیزوں کا مجموعہ ہے: ایک قانون، دوسرے حکمت، اور اس کا مقصد انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تزکیہ ہے۔ انسان جب اس قانون و حکمت کو پوری طرح اختیار کر لیتا ہے تو تزکیہ اس کے لازمی نتیجے کے طور پر اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے کہیں اور جانے اور کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۳۲۵۔ یعنی تو زبردست ہے، اس لیے تیرا حق ہے کہ تو لوگوں کو اپنا قانون دے اور صاحب حکمت ہے، لہٰذا تیری اس صفت کا تقاضا ہے کہ تو انھیں بھی حکمت عطا فرمائے۔

۳۲۶۔ اشارہ یہود کی طرف ہے اور اسلوب میں تعجب بھی ہے اور افسوس بھی۔ مطلب یہ ہے کہ دینِ ابراہیمی کے تنہا اجارہ دار بنے ہوئے ہیں، لیکن وہی دین جب اس کی صحیح صورت میں ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اس سے گریز اور فرار کے راستے تلاش کرنے لگتے ہیں۔

۳۲۷۔ یعنی اپنے دین کی امامت اور پیشوائی کے لیے خاص کیا۔ اس کا ذکر اسی سلسلۂ بیان میں اوپر گزر چکا ہے۔

۳۲۸۔ اصل میں 'اسلم' اور 'اسلمت' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کا صحیح مفہوم حوالے کر دینے ہی سے ادا ہوتا ہے۔ یہاں ان سے سیدنا اسمٰعیل کی قربانی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اسی امتحان میں

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ﴿۱۳۲﴾

اور اسی دین کی نصیحت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو کی تھی اور اِسی کی نصیحت یعقوب نے کی تھی۔[۳۲۹] (اُس نے کہا تھا کہ) میرے بچو، اللہ نے یہی دین[۳۳۰] تمھارے لیے منتخب فرمایا ہے، اِس لیے اب موت کے وقت تک تمھیں ہر حال میں مسلمان ہی رہنا ہے۔[۳۳۱] ۱۳۲

کامیابی کے بعد امامت کی عزت سے نوازے گئے۔ یہ اپنے آپ کو پوری طرح سپرد کرنے کا ایسا تقاضا تھا کہ اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں تعبیر یہی ہو سکتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے معنی اپنے آپ کو ہر لحاظ سے اپنے پروردگار کے حوالے کر دینے کے ہیں۔ سیدنا ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے اسی اسلام کا حکم دیا تھا، انھوں نے اسے ہی اختیار کیا اور ان کو جو امامت حاصل ہوئی، وہ اسی کے نتیجے میں حاصل ہوئی۔ یہودیت یا نصرانیت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور نہ یہ عزت انھیں مفت میں حاصل ہوئی تھی، جس طرح کہ یہود اسے حاصل کرنا چاہتے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۲۹۔ اصل الفاظ ہیں: 'ووصّٰی بھا ابراھیم'۔ ان میں 'توصیة' کے معنی تلقین و نصیحت کرنے کے ہیں، عام اس سے کہ یہ تلقین و نصیحت مرتے وقت کی جائے یا زندگی کے کسی دوسرے مرحلے میں، اور 'بھا' میں ضمیر کا مرجع وہی 'ملة ابراھیم' ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا ہے۔ سیدنا یعقوب کی اس سے ملتی جلتی ایک وصیت تالمود میں بیان ہوئی ہے، لیکن ابراہیم علیہ السلام کی وصیت کا ذکر یہود کے صحیفوں میں کہیں نہیں ملتا۔ قرآن نے واضح کیا ہے کہ یہ اصلاً انھی کی روایت تھی جسے سیدنا یعقوب نے بھی قائم رکھا۔ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کا ذکر اس لیے ہوا ہے کہ بنی اسرائیل براہِ راست انھی کی اولاد تھے، اور یہاں انھی کو بتانا مقصود ہے کہ تمھارے یہ آبا اسلام ہی کے پیرو تھے۔ انھوں نے اپنی اولاد کو کبھی یہودیت یا نصرانیت کی وصیت نہیں کی۔

۳۳۰۔ اصل میں لفظ 'الدین' استعمال ہوا ہے۔ اس میں لام عہد کا ہے اور اس سے مراد وہی دینِ ابراہیمی، یعنی اسلام ہے جس کی وصیت کا ذکر اس سے پہلے ہوا ہے۔

۳۳۱۔ یعنی اس راہ کی ہر آزمایش اور اس میں شیطان کی ہر دراندازی کے باوجود مہد سے لحد تک تمھیں اسی دین کے لیے جینا اور اسی کے لیے مرنا ہے۔

(باقی)

طالب محسن

خیالات

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۶۴)

عن أبی هریرة رضی اللّٰه قال: جاء ناس من أصحاب رسول اللّٰه إلی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم. فسألوه: إنا نجد فی أنفسنا ما یتعاظم أحدنا أن یتکلم به. قال: أو قد وجدتموه؟ قالوا: نعم. قال ذاک صریح الایمان.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگ آئے اور انھوں نے پوچھا: ہم اپنے دل میں ایسے خیالات پاتے ہیں جنھیں زبان پر لانا ہمیں بڑی بات لگتا ہے۔ آپ نے پوچھا: کیا تم ایسا ہی پاتے ہو؟ لوگوں نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: یہ تو واضح ایمان ہے۔''

لغوی مباحث

یتعاظم: کسی چیز کو بڑا دیکھنا۔ اس سے یہاں سوالات کا دینی اعتبار سے اچھا نہ ہونا مراد ہے۔

صریح الایمان: یہ صفت کی موصوف کی طرف اضافت ہے۔ یعنی یہ پختہ ایمان کی علامت ہے۔

متون

اس روایت کے دوسرے طرق لفظی فرق کے ساتھ ایک ہی مضمون کے حامل ہیں۔ یعنی دوسرے متون

مختلف ہونے کے باوجود کسی معنوی اضافے یا کمی کو بیان نہیں کرتے۔ بہر حال ایک لفظی فرق یہ ہے کہ زیادہ متون میں سوال ایک جماعت کے سوال کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ جبکہ مسند احمد کے ایک متن کے مطابق آپ کے پاس آنے والا آدمی ایک ہی تھا اور اسی نے یہ سوال کیا تھا۔ دوسرا فرق سوال کے الفاظ کا ہے۔ مثلاً ایک روایت میں سوال کے الفاظ یہ ہیں: 'نجد فی أنفسنا الشئ نعظم أن نتكلم به أو الكلام به ما نحب أن لنا و أنا تكلمنا به'، 'ہم اپنے دل میں وہ چیز پاتے جسے بیان کرنا ہمیں ایک بڑی بات لگتا ہے۔ ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ اس کی نسبت ہم سے ہو یا ہم اسے بیان کریں'۔ دوسری روایت میں یہی سوال ایک اور اسلوب میں ہے: 'إنی أحدث بنفسی لأن أخر من السماء أحب إلی من أن نتكلم به'، 'میں دل میں وہ باتیں کرتا ہوں کہ مجھے انھیں بیان کرنے سے اپنا آسمان سے گر نا زیادہ پسند ہوگا' یہ اور اس سے ملتے جلتے اور جملے بھی روایت ہوئے۔ لیکن ان سب کا مدعا ایک ہی ہے۔

معنی

پہلا سوال یہ ہے کہ دل میں آنے والے خیالات کی نوعیت کیا ہے۔ روایت کے متون اس معاملے کو واضح نہیں کرتے۔ مسلم نے اس روایت کو لیا ہے اور اسے اس باب میں درج کیا ہے جس کا عنوان: 'باب بیان الوسوسة فی الایمان...' ہے۔ اس باب میں انھوں نے خدا کی ذات کے بارے میں اٹھنے والے وسوسوں سے متعلق احادیث جمع کی ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ ان کے نزدیک اس روایت میں بیان کیا گیا سوال ذاتِ خداوندی کے بارے میں پیدا ہونے والے وسوسوں ہی سے متعلق ہے۔ شارحین نے بھی اسے اسی معنی میں لیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً اس روایت کا آخری جملہ ہے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ان وسوسوں پر پریشان ہونے کو 'صریح الایمان' قرار دینا، اس بات کا قرینہ ہے کہ وسوسے ایمان ہی سے متعلق تھے۔ یہ بات اس روایت کو صرف ایک نوعیت کے وسوسوں تک محدود کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہر طرح کے خیالات جو دین، ایمان اور اخلاق کے منافی ہوں، اس روایت میں بیان کیے گئے اصول کے تحت ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آدمی ان کے آنے پر اپنے عقیدہ و عمل کی صحت کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے تو یہ اس کے ایمان کے فعال ہونے کی دلیل ہے اور اسی پہلو کو بیان کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح الایمان کی تعبیر اختیار کی ہے۔

اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ غلط اور برے خیالات پر گرفت نہیں کی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ غلطی کو غلطی کی حیثیت سے دیکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات سے یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

غلط خیالات سے چھٹکارا پانے کی خواہش اچھی ہے، لیکن ان سے بالکلیہ نجات کو ہدف بنا لینا ایک غیر فطری ہدف ہے۔ اور دوسری بات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ خیالات ہی کی سطح پر کیوں نہ ہو، غلطی بہر حال غلطی ہے اس کے معاملے میں بے پروائی موزوں نہیں۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ خیالات ہی خواہشات میں ڈھلتے اور خواہشات ہی ارادوں اور ارادے عمل کو وجود بخشتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں یہ مضمون براہِ راست زیرِ بحث نہیں آیا، لیکن دو نکات اس روایت میں بیان کیے گئے مضمون سے متعلق ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل چیز دل کا تقویٰ اور دل کی طہارت ہے، چنانچہ واضح الفاظ میں شیطانی وساوس پر متنبہ رہنے کی تاکید اور ایسے موقع پر اللہ سے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ برائی کے ظاہری اور باطنی مظاہر سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ باطنی مظاہر سے جہاں برائی کی طرف لے جانے والا ماحول یا مقدمات یعنی برائی کی طرف بڑھانے والے اعمال مراد ہیں، وہیں اس سے برے خیالات بھی مراد ہیں۔ ظاہر ہے، جو بندۂ مومن یہ دونوں چیزیں پیشِ نظر رکھتا ہے، وہ 'ذلک صریح الایمان' کے اطمینان بخش جواب کا پوری طرح اہل ہے اور جو شخص اپنی باطنی طہارت کے معاملے میں بے پروا ہے۔ اس نے اپنی باگیں شیطان کے ہاتھ میں دے دی ہیں اور وہ کسی بھی برائی میں پڑ سکتا ہے۔

اس روایت سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو صرف دین و شریعت کے اصول و فروع ہی کی تعلیم نہیں دیتے تھے، بلکہ ان کو درپیش عملی اور نفسیاتی مسائل میں بھی ان کی رہنمائی فرماتے تھے۔

کتابیات

مسلم، کتاب الایمان، باب ۶۰۔ ابوداؤد، کتاب الادب، باب ۱۱۸۔ مسند احمد مسند ابوہریرۃ۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

غلط سوال

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:٦٥)

عن أبی هریر ة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: یأتی الشیطان أحدکم، فیقول: من خلق کذا؟ من خلق کذا؟ حتی یقول: من خلق ربک؟ فإذا بلغه، فلیستعذ بالله و لینته.

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر ایک کے پاس شیطان آتا ہے۔ پھر وہ سوال کرتا ہے: اس کو کس نے پیدا کیا؟ اس کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ وہ یہ بھی پوچھتا ہے: تیرے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب وہ اس بات تک پہنچے تو اللہ کی پناہ مانگو۔''

لغوی مباحث

فإذا بلغه: اس جملے کو دو صورتوں میں کھولا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ 'فإذا بلغ أحدکم هذا القول' دوسری یہ کہ 'فإذا بلغ الشیطان هذا السؤال'۔ سیاق و سباق کے مطابق دوسری صورت زیادہ موزوں ہے۔

متون

اس روایت کے متون میں فرق بھی محض لفظی ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں 'یأتی الشیطان أحدکم'

کی جگہ 'يأتي العبد الشيطان' آیا ہے۔ ایک دوسری روایت میں سوالات 'من خلق كذا و كذا' کے مختصر اسلوب کے بجائے 'من خلق السماء؟ فيقول: الله عز و جل. فيقول: من خلق الارض؟ فيقول: من خلق الله' کے تفصیلی اسلوب میں ہیں۔ اسی طرح روایت کے آخر میں 'من وجد' کے موقع پر 'فأذا أحس' اور 'فليستعذ بالله و لينته' کے بدلے 'فليقل آمنت بالله و برسله' الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔

مسند احمد میں اسی مضمون کی ایک دوسری روایت بیان ہوئی ہے، اس روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ جب کوئی یہ سوال پوچھے تو اسے کیا جواب دیا جائے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عن أبي هريرة رضى الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ليسئلنكم الناس عن كل شئ حتى يقولوا: الله خلق كل شئ فمن خلقه؟.....قال جعفر: بلغني أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا سألكم الناس عن هذا، فقولوا: الله كان قبل كل شئ والله خلق كل شئ و الله كائن بعد كل شئ. (احمد، مسند ابوہریرہ)

”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ لوگ تم سے ہر چیز کے بارے میں پوچھیں گے۔ یہاں تک کہ وہ یہ سوال بھی کریں گے کہ اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، پھر اس کو کس نے پیدا کیا ہے؟...... جعفر کہتے ہیں: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب لوگ تم سے اس کے بارے میں سوال کریں تو کہنا: اللہ ہر چیز سے پہلے تھا۔ اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ اور ہر چیز کے بعد وہی ہوگا۔“

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس روایت اور اس مضمون کی حامل دوسری روایات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مختلف مواقع پر بیان کیا ہے، تاکہ مسلمان ان سوالات کے شر پر متنبہ رہیں۔

معنی

اللہ تعالیٰ کا خالق کون ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس سے ہر آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت میں ایک بات تو یہ بیان کی ہے کہ اس سوال کا القا شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور وہ اس سوال تک پہنچانے میں ایک خاص ترتیب اختیار کرتا ہے۔ دوسری بات یہ واضح کی ہے کہ جب تمھیں اس سوال سے

سابقہ پیش آئے تو اس کے شر سے بچنے کا راستہ کیا ہے۔

جب اس سوال کا باعث شیطان ہے تو یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ یہ سوال اپنے مصدر و منبع کے اعتبار سے بے اصل ہے۔ یعنی اس سوال کے پیچھے کوئی حقیقی علمی اشکال موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں اس معاملے میں چند بنیادی باتیں بڑی صراحت کے ساتھ بتا دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے مثل اور اس سے مشابہ کوئی شے موجود نہیں ہے۔ اس کی ذات کو مخلوقات کے زمرے میں داخل کرنا قرآنِ مجید کی آیت 'لیس کمثله شئ' (الشوریٰ ۴۲: ۱۱) کے واضح طور پر منافی ہے۔ اسی طرح سورۂ اخلاص میں 'لم یلد ولم یولد'، 'نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا' (۱۱۲: ۳) کے الفاظ میں بھی اس سوال کے ایک پہلو کا جواب دے دیا گیا۔ مزید دیکھیے، 'هوالاول و الآخر و الظٰهر و الباطن'، 'وہ اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے' (الحدید ۵۷: ۳) کا مفہوم بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ مخلوقات کے برعکس اللہ تعالیٰ زمان و مکان سے بالاتر ہستی ہیں۔ قرآنِ مجید کی ان واضح نصوص کے ہوتے ہوئے یہ سوال اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک شیطانی وسوسہ ہے۔

اس روایت کا اصل مدعا اس شیطانی وسوسے کے مقابلے کی راہ بتانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے کہ جب شیطان اس سوال تک پہنچے تو اس سوال در سوال کے سلسلے کو فوری طور پر روک دینا چاہیے اور شیطانی وسوسوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

ہم اوپر والی روایت کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں کہ قرآنِ مجید میں شیطان کی دراندازیوں سے واضح طور پر متنبہ کیا گیا ہے۔ شیطان کے وسوسوں سے بچنے کے لیے تعوذ کی تلقین اور تعوذ کے الفاظ بھی تلقین کیے گئے ہیں۔ اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص نوعیت کے وسوسے کا ذکر کر کے قرآنِ مجید ہی کے تعلیم کیے ہوئے طریقے سے استفادے کی نصیحت کی ہے۔

کتابیات

بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ۱۸۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۶۰۔ ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب ۱۹۔ مسند احمد، مسند ابوہریرہ۔

طالب محسن

سوال کا جواب

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:٦٦)

عن أبی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يزالون الناس يتساءلون حتی يقال: هذا خلق الله الخلق فمن خلق الله؟ فمن وجد من ذلک شيئا. فليقل: آمنت بالله و رسله.

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ سوالات پوچھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ یہ بھی کہہ دیتے ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا، مگر یہ اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ تم میں سے جس کے ساتھ اس طرح کا معاملہ پیش آئے تو وہ کہہ دے: میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا۔''

لغوی مباحث

هذا: سیاق میں موجود یا کسی معہود بات کے لیے بولتے ہیں۔ پوری بات یوں ہے: 'هذا كذا' یوں تو ہے۔

متون

اس روایت کے متون میں کچھ لفظی فرق ہیں۔ مثلاً، بعض روایات میں 'آمنت بالله' کے ساتھ 'ورسله' کا لفظ نہیں ہے۔ ایک روایت میں 'یتساءلون' کی جگہ 'تستفتون' آیا ہے اور آخر میں تعوذ کا طریقہ بھی بیان نہیں ہوا۔

بعض روایات میں ابتدائی حصہ تو اس سے ملتا جلتا ہے، لیکن تعوذ بہت مختلف ہے۔ ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعوذ سکھایا تھا: 'فقولوا: الله أحد الله الصمد لم يلد ولم يولد و لم يكن له كفوا أحد، ثم ليتفل عن يساره ثلاثا و ليستعذ من الشيطان'، 'پھر (اس موقع پر کہو) اللہ ایک ہے اللہ سب کا سہارا ہے، نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا ہم سر ہے۔ پھر دائیں طرف تین مرتبہ تھوکے اور شیطان سے پناہ مانگے'۔ جبکہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعوذ خود ابوہریرہ نے اپنے طور پر پڑھا تھا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عن أبي هريرة رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يزالون.....الخ. فقال فوالله إني جالس يوما إذ قال لي رجل من أهل العراق هذا الله خلقنا. فمن خلق الله عزوجل قال فجعلت أصبعي في أذني ثم صحت فقلت صدق الله و رسوله الله أحد .....الخ.

(احمد، مسند ابوہریرہ)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے (پہلے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (مذکورہ روایت کہ) لوگ پوچھتے رہیں گے .....بیان کی۔ پھر بتایا کہ بخدا میں ایک دن بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عراقی نے مجھ سے پوچھا: یہ اللہ ہے جس نے ہمیں تخلیق کیا، پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ طبیعت میں ذرا ٹھیراؤ آیا تو میں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کی بات سچی ہوئی۔ اللہ ایک ہے....."

سورۂ اخلاص سے ماخوذ اس جواب پر مبنی یہ دونوں روایتیں اگرچہ بخاری و مسلم میں نہیں ہیں، لیکن یہ جواب معنوی اعتبار سے زیرِ بحث سوال کے لیے بہت موزوں ہے۔ لہٰذا اقرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے تعلیم کیا ہے۔

معنی

یہ روایت اپنے مفہوم و معنی میں اوپر والی روایت سے صرف اسی پہلو سے مختلف ہے کہ اس میں تعوذ کے بجائے ایمان کی تذکیر کا راستہ بتایا گیا ہے۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے پہلی روایت سے مختلف بات نہیں ہے۔ شیطان سے پناہ مانگنے کا جذبہ ایمان کی تذکیر کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ پہلی روایت میں یہ بات ایک مضمر کی حیثیت سے موجود تھی، یہاں اسے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید میں بھی شیطانی وساوس سے مقابلے کے لیے یاد اور تعوذ کا یہ تعلق پوری وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ. اِنَّ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰۤئِفٌ مِّنَ الشَّيۡطٰنِ تَذَكَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ. (الاعراف ۷: ۲۰۰-۲۰۱)

”جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے، وہ خدا کا دھیان کرتے ہیں اور دفعتہً ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔“

مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کی وضاحت میں لکھا ہے:

”فرمایا کہ جو لوگ جہالت کے بجائے تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں جب کبھی انھیں جاہلوں کی جہالت اور شیاطین کی شیطنت کا جھٹکا لگتا ہے تو وہ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں جس سے فوراً ان کا باطن روشن ہو جاتا ہے اور اشرار و معاندین کی ساری خاک بازی کے باوجود ان کی راہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتی یہ گویا اس استعاذہ کا طریقہ اور فائدہ بتا دیا گیا ہے جس کی اوپر والی آیت میں ہدایت ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ میں داخل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کو یاد کرے۔ یہ چیز دل کے اندر ایسی قوت اور بصیرت پیدا کر دے گی کہ دفعتہً آنکھوں کے آگے سارا غبار چھٹ جائے گا۔“ (تدبرِ قرآن، ج ۳، ص ۴۱۲)

بعض روایت میں ایمان کی تذکیر اور تعوذ کے کلمات یکجا بھی روایت ہوئے ہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کتابیات

مسلم، کتاب الایمان، باب ۶۰۔ ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب ۱۹۔ مسند احمد، مسند ابوہریرہ۔

میزان

جاوید احمد غامدی

قانونِ جہاد

(۲)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۔ جہاد کا اذن

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ. الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ. (الحج ۲۲: ۳۹-۴۰)

”جن سے جنگ کی جائے، انھیں جنگ کی اجازت دی گئی، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ وہ جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔“

یہ قرآن کی پہلی آیات ہیں جن میں مہاجرینِ صحابہ کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ اگر چاہیں تو جارحیت کے جواب میں جنگ کا اقدام کر سکتے ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنھیں بالکل بے قصور محض اس جرم پر ان کے گھروں سے نکلنے کے لیے مجبور کر دیا گیا کہ وہ اللہ ہی کو اپنا رب قرار دیتے ہیں۔ قریش کے شدائد و مظالم کی پوری فرد قرار دادِ جرم، اگر غور کیجیے تو اس ایک جملے میں سمٹ آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے وطن اور گھر در کو اس وقت تک چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، جب تک اس کے لیے وطن کی سرزمین بالکل تنگ نہ کر دی جائے۔ 'بانهم ظلموا' کا اشارہ انھی مظالم کی طرف ہے اور قرآن نے انھی کی بنیاد پر مسلمانوں کو یہ حق دیا ہے کہ اب وہ جارحیت کے خلاف تلوار اٹھا سکتے ہیں۔

'الذین اخرجوا من دیارھم' کے جو الفاظ ان آیات میں آئے ہیں، ان سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت ہجرت سے پہلے نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقتدار کے بغیر قتال لازماً فساد بن جاتا ہے، اس لیے انسانوں کی کسی جماعت کو اس کا حق اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا، جب تک وہ کسی خطۂ ارض میں ایک باقاعدہ اور منظم حکومت کی صورت اختیار نہ کر لیں۔ مکہ میں یہ چیز مسلمانوں کو حاصل نہیں ہوئی، لیکن ہجرت کے بعد جب میثاقِ مدینہ کے نتیجے میں یثرب کا اقتدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہو گیا تو اس کے فوراً بعد جنگ کی اجازت دے دی گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس وقت بھی مسلمانوں کی مدد پر پوری قدرت حاصل تھی، جب مکہ میں وہ بدترین مظالم کا ہدف بنائے گئے، مگر جنگ اس کے باوجود ممنوع رہی، یہاں تک کہ برسوں ستم جھیلنے اور ظلم اٹھانے کے بعد لوگ بالآخر گھروں سے نکلنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ نصرتِ الٰہی کا جو ضابطہ سورۂ انفال میں بیان ہوا ہے،[3] اس کی رو سے سو کے مقابلے میں وہ اگر دس بھی ہوتے تو اس زمانے میں جنگ کا نتیجہ لازماً انھی کے حق میں نکلتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مدینہ ہجرت سے پہلے انھیں اس کی اجازت نہیں دی گئی؟ اس سوال پر جس پہلو سے بھی غور کیجیے، یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس کا سبب یقیناً وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ انبیا علیہم السلام کی پوری تاریخ اسی حقیقت کی گواہی دیتی ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں معلوم ہے کہ انھوں نے جہاد و قتال کے لیے اس وقت تک کوئی اقدام نہیں کیا، جب تک بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر اپنی حکومت کے تحت ایک آزاد علاقے میں منظم نہیں کر لیا۔ مسیح علیہ السلام کی دعوت میں یہ مرحلہ نہیں آیا تو انھوں نے جہاد و قتال کا نام بھی نہیں لیا، دراں حالیکہ خود ان کے بقول وہ تورات کو منسوخ کرنے نہیں، بلکہ پورا کرنے کے لیے آئے تھے،[4] اور تورات کے بارے میں معلوم ہے کہ اس میں قتال کا حکم پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے۔[5] صالح، ہود، شعیب، لوط، ابراہیم اور نوح علیہم السلام جیسے جلیل القدر رسولوں کی سرگزشت بھی یہی بتاتی ہے۔ قرآنِ مجید کی مکیات اسی بنا پر اس ذکر سے خالی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اقتدار حاصل نہ ہوتا تو انجیل کی طرح قرآن میں بھی قتال کی کوئی آیت نہ ہوتی۔ چنانچہ یہ بالکل قطعی ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی حیثیت میں آیاتِ قتال کے مخاطب

۳۔ ۸: ۶۵-۶۶۔

۴۔ متی باب ۵، آیات ۱۷-۱۸۔

۵۔ استثنا باب ۲۰، آیات ۱-۲۰۔

ہی نہیں ہیں۔ حدود و تعزیرات کی طرح ان آیات کے مخاطب بھی ان کے حکمران ہیں اور اس معاملے میں کسی اقدام کا حق انھی کو حاصل ہے۔ سورۂ حج کی زیرِ بحث آیات میں 'اذن' کا لفظ اسی حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قتال سے متعلق پہلا مسئلہ جواز و عدمِ جواز کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قریش کی طرف سے ظلم و عدوان کے باوجود زمانۂ رسالت میں سیاسی اقتدار کی جس شرط کے پورا ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو اس کی اجازت دی، اس کے بغیر یہ اب بھی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہو سکتا۔[6] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر فرمایا ہے:

انما الامام جنة، یقاتل من ورائه و یتقی به. (بخاری، رقم ۲۹۵۷)

''مسلمانوں کا حکمران ان کی سپر ہے، قتال اسی کے پیچھے رہ کر کیا جاتا ہے اور لوگ اپنے لیے اُسی کی آڑ پکڑتے ہیں۔''

فقہا کا موقف بھی اس معاملے میں یہی ہے۔ ''فقہ السنتہ'' میں ہے:

النوع الثالث من الفروض الکفائیة ما یشترط فیه الحاکم، مثل، الجهاد واقامة الحدود، فان هذه من حق الحاکم وحده، ولیس لای فرد ان یقیم الحد علی غیره. (السید السابق، ج۳، ص۱۰)

''کفایہ فرائض کی تیسری قسم وہ ہے جس میں حکمران کا ہونا لازم ہے، جیسے جہاد اور اقامتِ حدود، اس لیے کہ اس کا حق تنہا حکمران کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کوئی شخص بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی دوسرے پر حد قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔''

(باقی)

۶۔ اس زمانے میں بعض لوگ اس کی تردید میں صلح حدیبیہ کے بعد قریش کے خلاف ابو بصیر رضی اللہ عنہ کی غارت گری سے استدلال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ محض علم و نظر کا افلاس ہے۔ قرآنِ مجید نے سورۂ انفال (۸) کی آیت ۷۲ میں پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ منتقل نہیں ہو سکے، ان کے کسی معاملے کی کوئی ذمہ داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ریاستِ مدینہ کے مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتی۔ پھر یہی نہیں، بخاری کی روایت (رقم ۲۷۳۱) کے مطابق خود حضور نے ابو بصیر کے ان اقدامات پر یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ 'ویل امه مسعر حرب لو کان له احد' (اس کی ماں پر آفت آئے، اسے کچھ ساتھی مل گئے تو جنگ کی آگ بھڑکا کر رہے گا)۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان اقدامات کے بارے میں آپ کی رائے کیا تھی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی / منظور الحسن

[مدیرِ ''اشراق'' کے افادات سے مرتب کیا گیا]

روزہ —— قرآنِ مجید کی روشنی میں

اسلامی شریعت میں جو عبادات لازم کی گئی ہیں ان میں نماز اور انفاق کے بعد روزے کی عبادت ہے۔ قرآنِ مجید کے مطابق یہ کوئی نئی عبادت نہیں ہے جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مشروع ہوئی ہے۔ یہ قدیم ترین عبادت ہے جو امتِ مسلمہ سے پہلی امتوں پر بھی فرض رہی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۸۳)

''اے ایمان والو، تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا۔ تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اللہ تعالیٰ نے اول البشر حضرت آدم علیہ السلام ہی کے زمانے سے انسانوں کو اپنی ہدایت دینے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (البقرہ ۲: ۳۸)

''تو اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کرنے کا پہلا وعدہ ہے۔ حضرت آدم کی لغزش سے انسانی فطرت اور انسانی عقل کا وہ ضعف ظاہر ہو گیا جو انسان کو وحیِ الٰہی کی رہنمائی اور انبیا علیہم السلام کی دست گیری کا محتاج ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کی اس کمزوری پر

نگاہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بطورِ تسکین و تسلی یہ وعدہ فرمایا کہ وہ خود اپنی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے روشنی بھیجے گا تو جو لوگ اس روشنی کی قدر کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ کوئی غم۔''

(تدبرِ قرآن ج ۱، ص ۱۷۰)

دینِ الٰہی کی صورت میں یہ ہدایت انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے بنی نوعِ انسان کو مسلسل ملتی رہی ہے۔ اس سلسلہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ انھوں نے دین کے بنیادی احکام انبیا کی روایت کی حیثیت سے اپنی امت میں جاری فرمائے۔ ان میں سے بعض قرآنِ مجید کے ذریعے سے اس امت پر لازم ہوئے ہیں اور بعض رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی تصویب سے جاری فرمائے ہیں۔ دین کے ان بنیادی احکام میں اللہ کی بندگی بجالانے کا ایک طریقہ نماز کی صورت میں مقرر کیا گیا ہے۔ پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ہدایات دی گئی ہیں اور انھیں انفاق سے تعبیر کر کے من جملہ عبادات قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح سال میں ایک ماہ کے روزوں کو عبادت کی حیثیت سے جاری رکھا گیا ہے۔

روزے کا مقصد —— تقویٰ

روزہ کس لیے فرض کیا گیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اس بات کو خود قرآنِ مجید نے 'لعلکم تتقون' کے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی بندوں پر روزہ اس لیے لازم کیا گیا ہے کہ ان کے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ تقویٰ کے مفہوم و مدعا کو ہم حسبِ ذیل عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں:

تقویٰ کا مفہوم

تقویٰ ہمارے دین کی خاص اصطلاح ہے۔ اس کا مدعا بالکل وہی ہے جسے ہم اردو زبان میں حدود آشنائی کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی انسان اس دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے نچنت اور بے خوف نہ رہے، بے پروائی اور لاابالی پن کا رویہ اختیار نہ کرے، بلکہ متنبہ ہو کر، بیدار ہو کر اور خبردار ہو کر زندگی گزارے۔ وہ اس بارے میں کبھی غفلت میں مبتلا نہ ہو کہ وہ اس دنیا میں کس لیے بھیجا گیا ہے، اس کا منتہا کیا ہے، اس کو ایک دن کس صورتِ حال سے دوچار ہونا ہے، اس کے لیے حقیقی زندگی کون سی ہے؟ وہ ان حقائق کے بارے میں پوری طرح متنبہ رہے اور زندگی کے کسی مرحلے میں بھی ان سے غافل نہ ہو۔ جب انسان اس تنبہ اور اس بیداری کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے تو پھر وہ اپنی خواہشات کی غلامی میں مبتلا نہیں ہوتا۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اللہ کی بندگی تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان دنیا میں اللہ کا فرماں بردار بندہ بن کر زندگی گزارے۔ انسان کے لیے اصل آزمایش ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی نعمتیں پا کر اس کا شکر گزار بندہ بن کر رہتا ہے یا کفرانِ نعمت کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ انسان جب نافرمانی، سرکشی اور انتہا پسندی سے گریز کر کے اللہ تعالیٰ کے حدود کی پاس داری کرتا ہے تو گویا وہ تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ اس بندگی کے معنی یہ ہیں کہ:

> ''بندہ اس تعلق میں اپنے پروردگار کی یاد سے اطمینان حاصل کرتا، اس کی عنایتوں پر اس کے لیے شکر کے جذبات کو اپنے اندر سیلِ بے پناہ کی طرح امڈتے ہوئے دیکھتا، اس کی ناراضی سے ڈرتا، اسی کا ہو رہتا، اس کے بھروسے پر جیتا، اپنا ہر معاملہ اس کے سپرد اور اپنے پورے وجود کو اس کے حوالے کر دیتا اور زندگی میں ہر قدم پر اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔'' (دین کا صحیح تصور، جاوید احمد غامدی)

اللہ کے ہاں جواب دہی کا احساس تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان ہر لحظہ اس بارے میں متنبہ رہے کہ اسے ایک روز احکم الحاکمین کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ ایک وہ وقت آنا ہے جب اسے اس کی ذمہ داریوں کے لیے جواب دہ ٹھہرایا جانا ہے۔ جواب دہی کا یہی احساس ہے جو انسان کو زندگی کی راہِ پر خار پر بچ بچا کر اور دامن کو سمیٹ کر چلنے کا طرزِ عمل سکھلاتا ہے۔ یہی احساس اور یہی طرزِ عمل اصل میں تقویٰ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ایک صحابی نے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ اگر کبھی آپ کسی کانٹوں بھرے راستے سے گزریں تو اس میں کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں؟ صحابی نے کہا کہ میں اپنے دامن کو سمیٹ لیتا ہوں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بس یہی تقویٰ ہے۔

تزکیۂ نفس کے لیے جدوجہد تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کے تزکیے کے لیے سرگرمِ عمل رہے۔ دین کا مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ انفرادی اور اجتماعی معاملات میں اپنے آپ کو پاکیزہ رکھنے کی کوشش ہی اصل میں تقویٰ ہے۔

اپنے نفس پر قابو پانا تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کے ان میلانات پر قابو رکھے جو اسے بدی پر ابھارتے ہیں۔ وہ غصے پر قابو رکھے، جذبات کے سیلِ رواں کو حدود میں رکھے، ردِ عمل کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو، نفرت اور کدورت کو اپنے

اندر پیدا نہ ہونے دے، مادی لذات اور نفسانی خواہشات کو حدود میں رکھے، بطن و فرج کے تقاضوں کو اپنے دینی واخلاقی وجود پر غلبہ نہ پانے دے۔ وہ یہ فیصلہ کر لے کہ اسے اپنے نفس کے آگے نہیں جھکنا، بلکہ اسے اپنے آگے جھکانا ہے۔ گویا تقویٰ سے مقصود نفس کو جھکانا ہے، اسے مارنا نہیں ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں اس حقیقت کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان لگا ہوتا ہے۔ پوچھا گیا کہ کیا آپ کے ساتھ بھی شیطان ہے؟ فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ بھی ہے مگر میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کو اپنے نفس کا گلا نہیں گھونٹ دینا چاہیے، بلکہ اسے حدود کا پابند بنانا چاہیے۔

ذمہ داری سے زندگی بسر کرنا تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں کو دل جمعی اور خلوصِ نیت کے ساتھ نبھائے۔ وہ ان حقوق کو ادا کرے جو اس کی انفرادی حیثیت میں اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ان فرائض کو بجالائے جو خاندان کے اندر اس پر لاگو ہوتے ہیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو جن کا تقاضا معاشرہ اور ریاست کرتے ہیں۔ یعنی آدمی اسی دنیا میں رہے، اسی میں اپنا رزق کمائے، اسی میں اپنا فعال کردار ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اسے اپنی اس فطرت سے انحراف کرنے کے بجائے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہی کوشش اور جدوجہد تقویٰ ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اخلاقی وجود کی حفاظت تقویٰ ہے

تقویٰ یہ ہے کہ انسان ہر وقت اپنے اخلاقی وجود کی نگہبانی کرتا رہے۔ یہ اخلاقی وجود ہی ہے جو انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر کا پورا شعور دے کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر وہ خیر و شر کے واضح ادراک کے ساتھ اچھا یا برا فیصلہ کرتا ہے۔ ہر اچھا فیصلہ کرتے وقت وہ ان اخلاقی اقدار اور ضوابط کو ملحوظ رکھتا ہے جو انسانیت کا شرف ہیں اور اس کے پروردگار نے اس کی فطرت میں ودیعت کیے ہیں۔ انھیں ہر انسان اپنے اندر ضمیر کی آواز کے طور پر محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ ان کا لحاظ کرتا ہے تو انسان ہے، اگر لحاظ نہیں کرتا تو پھر محض دو ٹانگوں کا ایک جانور ہے، اس کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اخلاقی وجود کی حفاظت و نگہبانی سے مراد یہ ہے کہ انسان ہر کام کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے کہ یہ

کام اس کے شایانِ شان ہے بھی یا نہیں۔ اس کا اخلاقی وجود اس سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ جھوٹ نہ بولے، دھوکا نہ دے، خیانت نہ کرے، ظلم نہ کرے، حق نہ مارے، بے انصافی نہ کرے۔ اخلاقی وجود اس سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ ذمہ داریوں کو پورا کرے، حقوق ادا کرے، صداقت کا بول بالا کرے، مخلوقِ خداوندی سے محبت کرے، نعمت پر شکر کرے، مصیبت میں صبر کرے، بڑے کا ادب کرے، چھوٹے پر شفقت کرے۔ غرض یہ کہ اپنے ضمیر کی آواز پر کان لگائے رکھے۔ وہ اگر کسی کام سے روک دے تو رک جائے اور اگر کسی کام کی ترغیب دے تو اسے بخوبی انجام دے۔

تقویٰ رہبانیت نہیں ہے

انسان کی آزمایش یہ ہے کہ اسے اپنی خواہشات، اپنے جذبات اور اپنی رغبات کے اندر رہی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے۔ انسانی جبلت میں موجود یہ ساری چیزیں پوراز ور لگاتی ہیں کہ وہ اعتدال اور توازن کے راستے پر نہ رہے۔ جب انسان ان کے خلاف جنگ کرتا ہے تو بعض اوقات دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ دوسری انتہا مذاہب میں رہبانیت کے نام سے موسوم رہی ہے۔ اس کی ایک بڑی دردانگیز تاریخ ہے۔ گویا انسان جب مادی زندگی کی لذتوں کو اپنا اصل ہدف بناتا ہے تو اس سے بہت غیر معمولی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے جب وہ ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں ترکِ دنیا کو اپنا ہدف ٹھیراتا ہے تو اس سے بھی بے پناہ مفسدات پیدا ہوتے ہیں۔ رہبانیت اور ترکِ دنیا کا مطلب یہ ہے کہ انسان ایک بار یہ فیصلہ کرلے کہ اسے دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو جانا ہے۔ اس دنیا کے اندر جو چیزیں اس کے لیے آزمایش کے طور پر پیدا کی گئی ہیں، انھیں چھوڑ دینا ہے۔ علم و عقل، مال و دولت، حسن و جمال، حشمت و اقتدار غرض مادی زندگی کے جو داعیات بھی انسان کو حدود سے تجاوز پر آمادہ کر سکتے ہیں، وہ انھیں بالکلیہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ وہ ایک ایسی زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں وہ نفس کے داعیات کا کم سے کم جواب دہ ہو۔ جب انسان رہبانیت کی یہ صورت اختیار کرتا ہے تو بظاہر وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے دنیا کی آزمایش میں اپنے لیے ایک آسان راستہ اختیار کر لیا ہے۔ یہ فیصلہ پہلی بار بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ایک بار جب کر لیا جاتا ہے تو پھر اس کے بعد اس میں وہ مشکلات نہیں رہتیں جن سے ایک متقی آدمی ہر روز گزر رہا ہوتا ہے۔ رہبانیت اور ترکِ دنیا کا یہ راستہ فطرت اور دین سے انحراف کا راستہ ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی شریعت انسان کو اعتدال اور توازن کا راستہ بتاتی ہے۔ وہ انسان کو جس چیز کی تربیت دیتی ہے وہ رہبانیت نہیں ہے، بلکہ تقویٰ ہے۔

تقویٰ کے حصول کا طریقہ

تقویٰ کی منزل کو پانے کا کیا طریقہ ہے؟ اس ضمن میں دو باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے:

ایک یہ کہ تقویٰ کے حصول کے لیے تدریج کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ دین کی حکمت بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اگر کوئی صلاحیت یا کوئی رویہ اپنے اندر پیدا کرنا چاہے تو وہ اسے فوراً پیدا نہیں کر سکتا، بلکہ ارادہ اور عمل کے مسلسل تعامل سے اسے بتدریج اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص نیکیوں کی ایک فہرست بنا کر اپنے سامنے رکھے اور انھیں فوراً اپنی شخصیت کا حصہ بنا لے۔ یہ ممکن نہیں کہ پانچویں جماعت کے بچے کو ایم۔ اے کا کورس پڑھانا شروع کر دیا جائے۔ علوم کے حصول لیے بہر حال تدریجی مراحل مقرر کرنے پڑتے ہیں۔ فنون سیکھنے کے لیے بھی مشق اور مزاولت کے تدریجی مراحل طے کیے جاتے ہیں۔ دینی و اخلاقی تربیت کا اصول بھی یہی ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی صورت میں ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا کہ بعثت کے ساتھ ہی پوری کتاب آپ کے سپرد کر دی ہو، بلکہ دعوت کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے تدریج کے ساتھ قرآن نازل فرمایا۔ چنانچہ تقویٰ کی منزل پانے کے لیے بھی تدریجی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اپنے روزمرہ معمولات میں یہ تین چیزیں لازماً شامل کر لی جائیں:

۱۔ روزانہ مسجد میں باجماعت نماز پڑھی جائے۔

۲۔ روزانہ چند آیاتِ قرآنی کی سمجھ کر تلاوت کی جائے۔

۳۔ ہفتے میں کم سے کم ایک بار کسی صالح بندۂ خدا کی مجلس میں کچھ وقت گزارا جائے۔

مسجد کا ماحول، قرآنِ مجید کی براہِ راست تذکیر اور بندۂ مومن کی صحبت کی تاثیر نخلِ تقویٰ کی آب یاری میں بنیادی کردار ادا کرے گی۔

روزہ تقویٰ کی تربیت گاہ ہے

تقویٰ کی تربیت دینے کے لیے شریعت نے روزے کی عبادت کو خاص کیا ہے۔ سال میں ایک مرتبہ ۷۲۰ گھنٹے کی تربیت گاہ قائم کر دی جاتی ہے اور نہایت غیر معمولی طریقے سے کروڑوں لوگ اس سے گزرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

”روزے کی عبادت اس تقویٰ کی تربیت کی خاص عبادت ہے جس پر تمام دین و شریعت کے قیام و بقا کا انحصار

ہے اور جس کے حاملین ہی کے لیے قرآن ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔ گویا قرآنِ حکیم کا حقیقی فیض صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہے جن کے اندر تقویٰ کی روح ہو اور اس تقویٰ کا خاص ذریعہ روزے کی عبادت ہے اس وجہ سے ربِ کریم و حکیم نے اس مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اس دنیا کے لیے بہار ہے اور رمضان کا مہینا موسمِ بہار ہے اور یہ موسمِ بہار جس فصل کو نشو و نما بخشتا ہے وہ تقویٰ کی فصل ہے۔" (تدبرِ قرآن ج ۱، ص ۴۵۱)

روزہ اللہ ہی کے لیے ہے

ایک بندۂ مومن روزہ رکھ کر در حقیقت اپنے پروردگار کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کرتا ہے اور فقط اس کی رضاجوئی کے لیے اپنی جسمانی ضرورتوں اور جائز خواہشوں سے بھی دست بردار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کو خاص اپنے لیے قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"ابنِ آدم کا ہر نیک عمل بڑھایا جائے گا، دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صرف روزے کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا، کیونکہ بندہ صرف میری ہی خاطر اپنی خواہشوں اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔" (مسلم، کتاب الصوم)

روزے کی شریعت

اہلِ عرب کے ہاں دیگر عبادات کی طرح روزہ بھی ایک معلوم و معروف عبادت تھی۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ قرآنِ مجید نے آکر اس عبادت کو شروع کیا۔ 'کما کتب علی الذین من قبلکم'، "جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا" کے الفاظ بھی اسی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں۔ چنانچہ روزے کی شریعت کے حوالے سے قرآنِ مجید نے صرف انھی معاملات کو واضح کیا جن کے بارے میں لوگوں کے ہاں کچھ ابہام موجود تھا یا جن میں کچھ تجدید و اصلاح کی ضرورت تھی۔ یہ معاملات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ ماہِ رمضان کا تعین

روزوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیا ہے۔ اس مہینے کو اس لیے خاص کیا گیا کہ اس میں قرآنِ مجید نازل ہونا شروع ہوا۔ ارشاد فرمایا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ   "رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن اتارا گیا

هُدًی لِّلنَّاسِ.(البقرہ۲:۱۸۵) لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر"

مولانا امین احسن اصلاحی اس پہلو کی وضاحت میں لکھتے ہیں :

"رمضان وہ مبارک مہینا ہے جس میں دنیا کی ہدایت کے لیے قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس عظیم نعمت کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا تاکہ اس میں بندے اپنے نفس کی خواہشات اور شیطان کی ترغیبات سے آزاد ہو کر اپنے رب سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکیں اور اپنے قول و فعل، اپنے ظاہر و باطن اور اپنے روز و شب، ہر چیز سے اس حقیقت کا اظہار و اعلان کریں کہ خدا اور اس کے حکم سے بڑی ان کے نزدیک اس دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔" (تدبرِ قرآن، ج ۱، ص ۴۵۱)

۲۔ گنتی کے چند دن

قرآنِ مجید نے روزوں کی مدت کو 'ایاماً معدودات' "گنتی کے چند دن" سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے مراد ماہِ رمضان کے ۳۰ یا ۲۹ دن ہیں۔ یعنی روزے کی یہ مشقت زیادہ عرصے کے لیے نہیں ڈالی گئی، بلکہ سال بھر میں یہ گنے چنے چند روز ہیں جن میں روزہ فرض کیا گیا ہے۔ گویا یہ تزکیۂ نفس اور تقویٰ کی تربیت کا محض چند روزہ کورس ہے، اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۳۔ روزے کے اوقات

روزے کے اوقات کے حوالے سے قرآنِ مجید کا ارشاد ہے :

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ. (البقرہ۲:۱۸۷)

"اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے پھر رات تک روزہ پورا کرو"

مولانا امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں :

"کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے، یہ چیز ہمارے روزوں کو اہلِ کتاب کے روزوں سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔ ان کے ہاں رات کو اٹھ کر کھانے پینے یا ازدواجی تعلقات کی اجازت نہیں تھی۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت دی بلکہ اس کی تاکید کی ہے۔ قرآن کے الفاظ سے بھی یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی یہ اجازت صبحِ صادق کے اچھی طرح نمایاں ہو جانے تک

ہے، اسی بات کی تائید احادیث اور صحابہ کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے محض احتیاط کے غلو کے سبب سے اپنے یا دوسروں کے روزے محض معمولی تقدیم و تاخیر پر مشتبہ قرار دے بیٹھنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔‘‘(تدبرِ قرآن ج ۱، ص ۴۵۹)

’’روزے کو رات ہونے تک پورا کرو‘‘ کے حکم کے اطلاق کے حوالے سے اس امت کے فقہا میں کچھ اختلاف رہا ہے۔ بعض فقہا کا خیال ہے کہ غروبِ آفتاب کے ساتھ رات کا آغاز ہوتے ہی روزہ کھول لینا چاہیے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک جب کچھ رات گزر جائے تو پھر روزہ افطار کرنا چاہیے۔ اس اختلاف کے نتیجے میں عملاً تقریباً دس پندرہ منٹ کا فرق پڑتا ہے۔ یہ بات کو سمجھنے کا اختلاف ہے۔ اسے بڑا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ جس بات پر اطمینان محسوس ہو اسے اختیار کر لینا چاہیے۔

۴۔ مریضوں اور مسافروں کے لیے رخصت

ابتدائی طور پر قرآنِ مجید نے یہ رخصت دی تھی کہ اگر کوئی شخص حالتِ مرض میں یا حالتِ سفر میں ہونے کی وجہ سے روزے چھوڑنا چاہے تو وہ بعد میں چھوڑے ہوئے روزوں کو پورا کر لے یا پھر ایک روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ ارشاد ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ. (البقرہ ۲: ۱۸۴)

’’اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کر دے۔ اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے‘‘

بعد ازاں قرآنِ مجید نے مسکین کو کھانا کھلا کر روزے سے بری ہونے کی اجازت ختم کر دی:

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ. (البقرہ ۲: ۱۸۵)

’’اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔‘‘

۵۔ رمضان کی راتوں میں ازدواجی تعلق کی اجازت

اہلِ عرب میں سے یہود کے ہاں روزے کی عبادت سب سے نمایاں تھی۔ ان کے ہاں افطار کے ساتھ ہی اگلا روزہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس وجہ سے انھیں رات کے اوقات میں کھانے پینے اور زن و شو کے تعلق کی ممانعت تھی۔ یہ صورتِ حال مسلمانوں کے لیے باعثِ تردد تھی۔ چنانچہ بعض مسلمانوں نے اسی تردد میں اپنے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

تئیں یہ تصور کر لیا کہ رات کے اوقات میں ازدواجی تعلق ممنوع ہے۔ پھر بعض لوگوں نے اپنے اس تصور کی خلاف ورزی بھی کر ڈالی۔ اسی کو قرآنِ مجید نے اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر فرمایا ہے، مسلمانوں کی یہ ہدایت چونکہ شریعت کے منشا کے مطابق نہیں تھی اور بعض محتاط مسلمانوں نے اسے از خود اپنے اوپر عائد کر لیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس خیانت سے درگزر فرمایا اور رات میں بیویوں سے تعلق کی اجازت دے دی:

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ. (البقرہ ۲: ۱۸۷)

”تمھارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا۔ وہ تمھارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم سے درگزر فرمایا تو اب تم ان سے ملو اور اللہ نے جو تمھارے لیے مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اعتکاف

اعتکاف رمضان کے آخری عشرے کی عبادت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بندۂ خدا ہر چیز سے کٹ کر اور دنیا کے ہر معاملے سے الگ ہو کر پوری یکسوئی کے ساتھ یادِ الٰہی کے لیے گوشہ نشین ہو جائے۔ قرآنِ مجید میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ. (البقرہ ۲: ۱۸۷)

”اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو تو اس حالت میں بیویوں سے نہ ملو۔“

اس آیت سے حسبِ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ یہ انبیا علیہم السلام کی سنت ہے۔ اعتکاف کا ذکر جس طریقے سے کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبادت پہلے سے موجود تھی۔

دوسرے یہ کہ اس عبادت کی مناسبت روزے اور رمضان کے ساتھ ہے۔

تیسرے یہ کہ اعتکاف مسجد ہی میں ہونا چاہیے۔

چوتھے یہ کہ اعتکاف کی حالت میں ازدواجی تعلق پر پابندی ہوگی۔

ماہِ رمضان تقویٰ کی تربیت پانے کا مہینا ہے۔ اس مہینے کو انسان اگر پوری قوتِ ارادی کے ساتھ اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کے لیے خاص کر دے تو وہ خواہشات اور جذبات کی غلامی سے نکل کر اپنے پروردگار کی غلامی میں آ جاتا ہے۔ یہی غلامی جنت کی ابدی بادشاہی کا پیش خیمہ ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اختر حسین عزمی

مولانا حمید الدین فراہی کا علمی مقام —— مشاہیر کی نظر میں

مقالہ نگار گورنمنٹ ڈگری کالج پتوکی میں لیکچرار ہیں اور پنجاب یونیورسٹی میں ''علوم اسلامی کی تشکیل جدید میں مونا امین احسن اصلاحی کا کردار'' کے موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مولانا حمید الدین فراہی ایک ایسے مجتہد اور متبحر عالم تھے جن کی فکرِ قرآنی نے اس دور کے بڑے بڑے مفکرینِ اسلام اور مفسرینِ قرآن کو بلاواسطہ یا بالواسطہ متاثر کیا۔ آپ کا علمی مقام و مرتبہ زعماے ملت کی نظر میں کتنا بلند تھا؟ یہ جاننے کے لیے ہم تین پہلوؤں سے اپنی تحقیقات پیش کریں گے۔

ا۔ اساتذہ و شیوخ کی نظر میں

زمانۂ طالب علمی ہی میں مولانا فراہی کا علمی پایہ مسلم تھا۔ عربی و فارسی میں وقت کے بڑے بڑے اساتذہ اور ادیب جن سے انھوں نے تعلیم حاصل کی، ان کی ذہانت اور علمی و فکری پختگی سے متاثر تھے۔ بیس سال کی عمر میں ہی وہ عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم میں دست گاہِ کامل حاصل کر چکے تھے۔

مولانا فراہی نے جن اساطین سے اکتسابِ فیض کیا ان میں سرِ فہرست علامہ شبلی نعمانی (۱۹۱۴ء) کا نام آتا ہے، جن کی تعلیم و تربیت نے ان کی فطری صلاحیتوں کو بیدار کیا اور انھیں علومِ عالیہ سے روشناس کیا۔ مولانا فراہی

کے فخر و امتیاز کے لیے یہی کافی ہے کہ علامہ شبلی ان کی کتابوں کی تلخیص خود کر کے ''الندوہ'' میں شائع کرتے تھے۔[1]

علامہ شبلی نے مجلہ ''الندوہ'' دسمبر ۱۹۰۵ء میں ان کی تصنیف ''جمہرۃ البلاغہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''ادب میں ان کی نظیر نہیں۔ مسلمانوں کے لیے اس کتاب کی وہی اہمیت ہے جو پیاسے کے لیے آب زلال ہوتی ہے۔'' (سید سلیمان ندوی، مولف ''مکاتیب شبلی'' جلد دوم، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۳۷ء، ص ۳۳)

''دارالمصنفین'' کا قیام پاک و ہند کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس کام میں معاونت کے لیے شبلی نعمانی کی نظرِ انتخاب جس شخص پر پڑی، وہ مولانا فراہی تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مولانا شبلی نے مولانا فراہی کو حیدر آباد خط لکھا جس میں اپنی گوناگوں بیماریوں کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں:

''اگر دارالمصنفین قائم ہوا تو تمھارے سوا اس کا انتظام وانصرام کون چلا سکتا ہے۔'' (یادِ رفتگان، ص ۵۴)

علامہ شبلی، مولانا فراہی کے قرآنی فکر کے قائل تھے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا حمید الدین فراہی نے نظمِ آیات کا جو تصور دیا، مولانا شبلی کو اپنے شاگرد کے اس نظریہ سے اختلاف تھا اور وہ مولانا فراہی کی کوششوں کو رائیگاں سمجھتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے ان کی تفسیر کے متعدد اجزا دیکھے تو قائل ہوتے چلے گئے اور آخر داد دینے لگے۔ اور آخر میں تو وہ حمید الدین کی نکتہ دانی کے اس درجہ قائل ہو گئے تھے کہ قرآنی مشکلات کے حل میں وہ ان سے مشورہ لینے لگے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تفسیر ابی لہب اور جمہرۃ البلاغہ کے اجزا بغور دیکھے، تفسیر پر تم کو مبارک باد دیتا ہوں۔ تمام مسلمانوں کو تمھارا ممنوں ہونا چاہیے۔'' (یادِ رفتگان، ص ۱۱۸-۱۱۹)

مولانا شبلی کا وہ کام جو ان کی پہچان بن گیا ''سیرۃ النبی'' لکھنا ہے۔ اس بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم اس وقت ''سیرۃ النبی'' کی پہلی جلد لکھ رہے تھے، یہود و نصاریٰ اور اہلِ کتاب کے مناظرانہ مسائل اور قرآنِ پاک کے استدلالات میں وہ برابر اپنے بھائی (مولانا فراہی) سے مشورہ لیتے رہے جو مکاتیب (۵۷-۷۳) سے ظاہر ہیں، سیرت جلد اول کے مقدمہ میں حضرت اسماعیل کی سکونت اور قربانی کے متعلق جو باب ہے اس کا مواد مولانا حمید الدین ہی نے بہم پہنچایا تھا۔'' (ص ۱۲۲)

۱۔ ''یادِ رفتگان''، سید سلیمان ندوی، ص ۱۱۷ مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی۔ ۱۹۸۳ء۔

اس کے علاوہ ''مکاتیب شبلی'' میں بیسیوں خطوط ایسے ہیں جن میں مولانا فراہی سے انھوں نے سیرت کے موضوع پر تحقیقی استفسار کیا ہے۔

مولانا فراہی نہ صرف اردو عربی اور فارسی میں بھی دسترس رکھتے تھے بلکہ انگریزی زبان و ادب میں بھی انھیں مستند سمجھا جاتا تھا۔ اس کا اندازہ سید سلیمان ندوی کی اس تحریر سے ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش سے نواب عماد الملک مرحوم نے قرآنِ پاک کے انگریزی ترجمہ کا جو کام شروع کیا تھا وہ نصف کے قریب انجام پا چکا تھا۔ مگر اس میں جا بجا نقائص تھے۔ نواب صاحب نے مولانا حمید الدین کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا۔ اور مدتوں تک یہ شغل جاری رہا کہ مولانا روزانہ صبح کو نواب صاحب کے یہاں جاتے اور نواب صاحب بایں ہمہ ضعف و پیری، انگریزی ترجمہ پر مل کر غور کرتے۔ اس طرح ان کے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر ثانی ہوئی۔'' (یادِ رفتگاں ص ۱۲۲)

علامہ شبلی کے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے بے مثل استاد اور ممتاز نقاد شخص تھے۔ مولانا فراہی نے بھی ان کی عالمانہ صحبت سے اکتساب فیض کیا۔ سولہ سال کی عمر میں فارسی میں قصیدہ لکھا جسے مولانا شبلی نے مولانا چریا کوٹی کے سامنے مولانا فراہی کا نام لیے بغیر پیش کیا تو انھوں نے کہا کہ ''یہ پرانے اساتذہ میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے۔''[۲]

شبلی نعمانی کے بعد مولانا فراہی نے جس استاد سے سب سے زیادہ اکتسابِ فیض کیا وہ اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر مولانا فیض الحسن سہارن پوری تھے، جو پورے برصغیر میں عربی زبان و ادب میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے ایسے عظیم استاد کی نظر میں مولانا فراہی کی کتنی قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا سہارن پوری نے اپنی ''شرح سبعہ معلقہ'' کا خود تحریر کردہ قلمی نسخہ مولانا فراہی کو بطور یادگار[۳] دیا۔

سر سید احمد خان، مولانا فراہی کے زمانۂ طالب علمی ہی میں ان کی عربی و فارسی کی قابلیت سے کس قدر متاثر تھے کہ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے خود سر سید احمد خان نے علی گڑھ میں داخلے کے وقت مولانا فراہی کے بارے میں انگریز پرنسپل مسٹر بک کو لکھ کر بھیجا کہ حمید الدین عربی و فارسی کے ایسے ہی فاضل ہیں جیسے آپ کے کالج کے استاد اور پروفیسر ہیں اس لیے ان کو علومِ مشرقی کے گھنٹوں سے مستثنیٰ کر دیا جائے چنانچہ وہ

۲۔ ''یادِ رفتگان''، ص ۱۱۳-۱۱۴۔

۳۔ ''یادِ رفتگان''، ص ۸-۹۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مستثنیٰ کیے گئے۔[4]

اس دوران سر سید نے مولانا شبلی سے عربی میں سیرت نبوی پر ایک مختصر رسالہ ''تاریخ بدء الاسلام'' کے نام سے لکھوایا پھر مولانا حمید الدین سے اس کا فارسی ترجمہ کرا کر اس وقت چھپوایا۔ مولانا فراہی کے زمانۂ طالب علمی ہی میں سر سید کو طبقات ابنِ سعد کا ایک ٹکڑا وفودِ نبوی کے متعلق کہیں سے ہاتھ آیا اس وقت یہ چھپی نہیں تھی مولانا فراہی سے اس کا فارسی ترجمہ کرا کے چھپوایا۔[5] اس کی زبان کو اتنا معیاری پایا کہ اسے کالج کے نصاب میں داخل کر لیا گیا۔[6] سر سید ہی کی خواہش پر امام غزالی کے ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ قلمی نسخے کو مولانا فراہی نے سیاقِ کلام اور امام غزالی کے اندازِ بیان کو اپنے علمی ذوق و عربی دانی کی مدد سے الفاظ کا تعین کرتے ہوئے اتنا اچھا ایڈٹ کیا کہ سر سید بھی حیران رہ گئے۔[7]

سر سید نے قرآنِ پاک کی تفسیر لکھی تو چاہا کہ اس کا عربی ترجمہ کرائیں۔ اس کے لیے انھوں نے شبلی سے اور پھر مولانا فراہی سے فرمایش کی لیکن دونوں حضرات نے ان سے تفسیری اختلاف کی بنا پر ترجمہ سے معذرت کر لی۔[8]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

علی گڑھ میں انگریزی اور فلسفہ جدیدہ میں مولانا فراہی کے استاد مشہور انگریز مستشرق پروفیسر آرنلڈ تھے۔ اسی زمانہ میں جب پروفیسر آرنلڈ انگریزی میں عربی گرائمر کی ایک مختصر کتاب ترجمہ کرانا چاہتے تھے تو اس کے لیے مولانا فراہی کا نام ہی ان کے ذہن میں تھا۔[9]

سر سید کے بعد ان کی تحریک میں جس شخصیت کا نام آتا ہے وہ ہے مولانا الطاف حسین حالی۔ مولانا فراہی کو

۴۔ ''یادِ رفتگان''، ص ۹۔

۵۔ ''یادِ رفتگان''، ص ۹۔

۶۔ ''مجموعۂ تفاسیر فراہی''، ص ۹، مرتبہ مولانا امین احسن اصلاحی، فاران فاؤنڈیشن لاہور۔

۷۔ ''یادِ رفتگان''، ص ۹، ۱۰۔

۸۔ (۱) ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ فروری ۱۹۹۱۔ ص ۹۲، مضمون: ''ترجمان القرآن... مولانا فراہی''، مصنف: ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی۔

(۲) ''حیات شبلی''، سید سلیمان ندوی، ص ۲۸۸، معارف پریس، اعظم گڑھ فروری ۱۹۹۱۔

۹۔ ''مکاتیب شبلی'' ج ۲، بنام مولانا حمید الدین۔ خط نمبر ۳۔

ان سے بھی صحبت رہی۔ سید سلیمان ندوی مولانا فراہی کے زمانۂ علی گڑھ کے متعلق لکھتے ہیں:

"علی گڑھ کے اوجِ شباب کا زمانہ تھا اور مولانا شبلی اس کے مدرس، مولانا حالی وہاں کے مقیم و ساکن تھے، ہر وقت علمی مسائل و تحقیقات کے چرچے رہتے تھے اور ان بزرگوں کی صحبتیں حاصل تھیں جن میں ہر ہونہار طالبِ علم کے فطری جوہر کے چمکنے کا موقع حاصل تھا۔" (یادِ رفتگاں، ص ۱۱۶)

مولانا حالی کو مولانا فراہی سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ مولانا فراہی نے اپنے زمانۂ کراچی کے دوران میں جب مولانا حالی کو شمس العلما کا خطاب ملنے پر مبارک باد کا خط لکھا تو مولانا حالی نے ۲۰ جولائی ۱۹۰۴ کو مولانا فراہی کے نام خط میں لکھا:

"شمس العلماء کا خطاب ملنے پر جس گرم جوشی اور مسرت کے ساتھ آپ نے خاکسار کو مبارک باد دی ہے اس کا شکریہ تہِ دل سے ادا کرتا ہوں اور اس کو اپنے لیے ایک دستاویز فخر و امتیاز کی سمجھتا ہوں۔..... آپ کے فصیح و بلیغ اشعار کو میں فخریہ کسی اخبار میں عنقریب چھپواؤں گا۔"

(مکتوب مولانا حالی بنام مولانا حمید الدین "مطبوعہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ" فروری ۱۹۱۸۔ ص ۵۴)

خط کے آخری حصہ میں مولانا حالی کے تحریر کردہ الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں مولانا فراہی کی کس قدر قدر و منزلت تھی، لکھتے ہیں:

"آج کل میں حد سے زیادہ عدیم الفرصت ہوں ورنہ آپ کا شکریہ ایسا سرسری طور پر معمولی الفاظ میں ہرگز نہ لکھتا۔" (محولا بالا)

۲۔ تلامذہ و معاصرین کی نظر میں

دینی ادب میں نام پیدا کرنے والے ادبا و فضلا کی ایک بڑی تعداد ہے جس نے یا تو باقاعدہ آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا یا آپ کی صحبتِ فیض رساں سے خوشہ چینی کی۔ مولانا سید سلیمان ندوی اپنے زمانۂ طالب علمی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"۱۹۰۵ سے مولانا (شبلی) خاص طور سے تقاضا کر کے (مولانا فراہی کو) بلواتے اور اپنے پاس ٹھیراتے۔ مقصود یہ تھا کہ ندوۃ کے طلباء ان سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ انھی کے اصرار سے کئی دفعہ ندوہ میں آکر رہے۔ اور وہ طلبہ کو کبھی فلسفۂ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھاتے۔ میں بھی اس زمانہ میں ندوہ کا طالب علم تھا۔ مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا۔" (یادِ رفتگان، ص ۱۲۰)

مولانا فراہی کی کتاب ''اقسام القرآن'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے (ربطِ آیات کے موضوع پر) امام رازی نے تفسیرِ کبیر میں جستہ جستہ فقرے لکھے تھے۔ پھر ابنِ قیم نے ''البیان فی اقسام القرآن'' لکھی، مگر مولانا حمید الدین صاحب کی تحقیقات نے اپنی الگ شاہراہ نکالی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں انھوں نے ایسی دادِ تحقیق دی کہ تیرہ سو برس میں کسی نے نہیں دی۔'' (یادِ رفتگان، ص ۱۱۹)

سید سلیمان ندوی کی نظر میں مولانا فراہی کا کیا مقام تھا؟ اس کی جھلک مولانا کی وفات پر لکھے گئے ان کے الفاظ میں نظر آتی ہے:

''اس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ جس کے فضل و کمال کی مثال آئندہ بظاہر حال عالمِ اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں۔ جس کی مشرقی و مغربی جامعیت عہدِ حاضر کا معجزہ تھی۔ عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ، زہد و ورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبلِ شیراز، عربی کا شوقِ عکاظ، ایک شخصیت مفرد، لیکن ایک جہانِ دانش، ایک دنیائے معرفت، ایک کائناتِ علم، ایک گوشۂ نشین مجمع کمال، ایک بے نوا سلطانِ ہند، علومِ ادبیہ کا یگانہ، علومِ عربیہ کا خزانہ، علومِ عقلیہ کا ناقد، علومِ دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقفِ اسرار، قرآن پاک کا دانائے رموز، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہلِ دنیا سے مستغنی، انسانوں کے ردو قبول اور عالم کی داد تحسین سے بے پروا، گوشۂ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ۔ وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآنِ پاک کے فہم و تدبر اور درس و تعلیم میں محو، ہر شے سے بیگانہ اور شغل سے ناآشنا تھی۔'' (یادِ رفتگان، ص ۱۱۰)

مولانا مناظر احسن گیلانی بھی مولانا فراہی کے خوشہ چینوں میں شامل ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میرا قیام دیو بند میں کچھ تو طالب علم کی حیثیت سے رہا اور کچھ مدرسہ کی خدمت میں گزرے کہ اچانک مقادیر نے حیدر آباد پہنچا دیا۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن دانی کا شہرہ سن چکا تھا۔ خدا نے ان کی صحبت کی سعادت سے سرفراز کیا۔ اور قرآن کے چند جدید پہلو مجھ پر مولانا کی صحبت میں کھلے۔''

(مولانا محمد عمران ندوی، ''مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں'' نشریاتِ اسلام کراچی، ۱۹۷۹ء۔ ص ۵۵)

ایک مقام پر مولانا مناظر احسن گیلانی ہندوستانی مفسرین کے کارنامے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''عجیب بات ہے کہ باوجود اہم ہونے کے اس وقت تک قرآن کے اس پہلو (ربطِ آیات) کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ اور کوئی تفسیر اس خاص نقطۂ نظر سے ایسی نہیں لکھی گئی جسے خصوصی حسنِ قبول اہلِ علم کے حلقوں سے حاصل ہوتا، سب سے پہلے اسی سلسلہ میں جو چیز نویں صدی کی ابتداء میں پیش ہوئی وہ ہندوستان

کے ایک عالم حضرت شیخ علی المہائمی کا کارنامہ ہے۔ یعنی اپنی تفسیر تبصیر الرحمٰن نامی میں علامہ مہائمی نے قرآن کے اس پہلو پر بحث کرنے میں بڑی دقتِ نظر سے کام لیا اور ان کی تفسیر کی امتیازی صفت یہی شمار ہوتی ہے۔

مگر یہ تو پچھلے زمانے کی بات ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ولی اللّٰہی تجدید کے بعد ہندوستان نے اپنی نشاۃ ثانیہ میں جو کام اس سلسلے میں انجام دیا، میرا اشارہ حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر نظام القرآن کی طرف ہے جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی بائیبل اور قرآن کے تعلقات اور ادبی مباحث) سب سے بڑی اور مشترک، خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کی تمام حصوں میں یہی ہے کہ انھوں نے آیاتِ قرآنی میں روابط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔"

(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، مولانا مناظر احسن گیلانی، ج ۲، ص ۲۷۹-۲۸۰)

نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد اہلِ علم کے قدر شناس تھے لہٰذا مولانا فراہی کی صحبت سے بھی اکتسابِ فیض کیا۔ مولانا فراہی کی وفات کے بعد سید سلیمان ندوی کو خط میں لکھا:

"مجھے مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا۔ ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی مرحوم تھے۔ علی گڑھ کی پروفیسری کے زمانہ میں ملا۔ پھر حیدر آباد میں۔ علی گڑھ کے دور میں بھی تدبرِ قرآن کا شرف جاری رہا۔ روزانہ تین بجے شب سے صبح نو بجے تک اس میں وقت صرف کرتے تھے۔ ملاقات کے وقت نتائجِ تحقیق بیان فرماتے۔ اس زمانہ میں دیگر کتبِ سماوی کا اور اس کی مدد سے مطالبِ قرآن کا حل خاص کر پیشِ نظر تھا۔"

(یادِ رفتگان، ص ۱۱۸)

دار العلوم ندوۃ العلما کے سابق ناظم مولانا عبد الحئ لکھنوی مولانا فراہی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"وہ چوٹی کے علما میں سے تھے۔ علومِ ادبیہ سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ انشاء وادب پر پورا عبور حاصل تھا۔ ادباء اور ادبی علوم سے انھیں بڑا لگاؤ تھا۔ فہم و فراست، ذکاوت و ذہانت، زہد و عفت، نیک نفسی و بلند ہمتی کی وہ تصویر تھے۔ لایعنی باتوں سے بہت دور، انبارِ دنیا سے بالکل بے پروا، عربی علوم میں انھیں رسوخ حاصل تھا۔ بلاغت پر گہری نظر تھی۔ جاہلی دواوین اردو عربی اسالیبِ کلام پر وہ حاوی تھے۔ صحفِ سماویہ کا بڑا وسیع مطالعہ تھا۔ یہود و نصاریٰ کی کتابوں پر اچھی نظر تھی۔ ان کی ساری دلچسپیوں اور عرق ریزیوں کا محور قرآن تھا۔ وہ قرآنِ پاک پر غور و تدبر کرتے، اس کے بحرِ معانی میں غواصی کرتے، اس کے تمام اسالیب کو سمجھنے کی کوشش

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کرتے۔ان کا عقیدہ تھا کہ پورا قرآن ایک مرتب و منظم کلام ہے۔ ساری آیات ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔ چنانچہ ان کی تفسیر نظام القرآن کا اصل الاصول یہی ہے۔"

(مولانا عبدالحیٔ لکھنوی "نزھتہ الخواطر"ج ۸، ص ۲۲۹، ۲۳۰، نورِ محمد کارخانہ کتب تجارت کراچی ۱۹۸۶)

مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی سابق امیر جماعتِ اسلامی ہند بھی مدرستہ اصلاح کے زمانۂ طالب علمی میں مولانا فراہی سے اکتسابِ فیض کرنے والوں میں شامل ہیں، لکھتے ہیں:

"وہ تقویٰ، زہد، علم و فضل اور ان اخلاقِ حسنہ کا جامع تھے جن سے سلف صالحین متصف تھے۔ عقائد کے باب میں حریتِ فکر، علومِ عصریہ کا گہرا مطالعہ، حالاتِ حاضرہ کی مکمل خبر اور مقتضیاتِ زمانہ سے حقیقی واقفیت ایسی خصوصیات ہیں جن میں اپنی مثال وہ آپ تھے۔" (ششماہی، "علوم القرآن"، مضمون: مولانا فراہی ..... حیات و خدمات"، مصنف مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی، جنوری۔ جون ۱۹۹۲، ص ۹۶ علی گڑھ)

دار المصنفین کے قیام کے لیے علامہ شبلی کی نظرِ انتخاب مولانا فراہی ہی پر تھی، جس کا اظہار ان کے اس جملے سے ہوتا ہے کہ "دار المصنفین قائم ہوا تو تمھارے سوا کون چلائے گا۔" علامہ موصوف کی وفات کے بعد ان کے ادھورے کام کی تکمیل کے لیے مجلسِ اخوان الصفا کی بنیاد ڈالی گئی جس کے صدر مولانا حمید الدین فراہی اور ناظم سید سلمان ندوی مقرر ہوئے۔"[10]

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس اولین کمیٹی نے ہندوستان کے جملہ مشاہیر سے خط کتابت کی، جو کامیاب رہی۔ چنانچہ ۲۵ مئی 1915 کو اعظم گڑھ میں دار المصنفین کا پہلا جلسہ ہوا جس میں حسبِ ذیل اصحاب کو رکنِ اساسی منتخب کیا گیا۔

(۱) مولانا حمید الدین، صدر (۲) سید سلیمان ندوی، ناظم (۳) مولانا مسعود علی ندوی، منیجر (۴) حامد نعمانی (۵) مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی (۶) نواب سید علی حسن خان (۷) پروفیسر شیخ عبد القادر (پونہ) (۸) علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال لاہور (۹) نواب سید حسین بلگرامی حیدر آباد (۱۰) مولانا عبد اللہ عمادی (۱۱) مولانا عبد الماجد دریابادی۔

اس مجلس نے دار المصنفین کے قواعد و ضوابط مرتب کیے۔[11]

بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں دار العلوم حیدر آباد کے لیے ایک ایسا نصاب تجویز کیا گیا جو مشرقی علوم

۱۰۔ "حیات سلیمان"، معین الدین ندوی، ص ۹۶، مطبع معارف پریس اعظم گڑھ۔

۱۱۔ "حیات سلیمان"، معین الدین ندوی، ص ۹۹، ۱۰۰ مطبع معارف پریس اعظم گڑھ۔

کے ساتھ ساتھ جدید علم میں بھی بہترین افراد تیار کرے مگر اس کو عملی شکل دینے کے لیے ایسے قائد کی ضرورت تھی جو مشرقی اور مغربی تعلیم سے آگاہ بھی ہو اور اس طرزِ تعلیم سے بھی ہم آہنگی رکھتا ہو۔ چنانچہ اس مجوزہ یونیورسٹی کے پرنسپل کی حیثیت سے مولانا فراہی کا نام تجویز ہوا۔ بالآخر جون ۱۹۱۴ میں آپ دار العلوم منتقل ہو گئے۔[۱۲]

یہاں پہنچ کر انھوں نے ایک اور اہم کام کی بنیاد رکھی جس کا ذکر سید سلیمان ندوی نے ''حیاتِ شبلی'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانا حمید الدین صاحب نے اس مجوزہ درس گاہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی یہ کہ دینیات اور ادبیات کے علاوہ اس درس گاہ میں سارے علوم اردو میں پڑھائے جائیں یہ بالکل نیا نیا خیال تھا اس لیے بڑی مشکل سے انھوں نے ارکانِ حکومت کو اس کے لیے راضی کیا۔''[۱۳]

اس دور میں جب مستشرقین نے دینِ اسلام کو اپنے بے بنیاد اعتراضات کا ہدف بنایا تو اکابرینِ قوم نے اس فکری یلغار کے مقابلے کے لیے ایک مجلس علم الکلام کی تجویز منظور کی۔ اس کے لیے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو قدیم فلسفہ کے ماہر، جدید تعلیم سے مانوس اور فلسفۂ جدیدہ کے اعتراضات کی تردید و تنقید کی قوت رکھتے ہوں، چنانچہ اس کے لیے ایک گروپ نامزد کیا گیا جس میں علامہ اقبال استاذ حمید الدین فراہی اور مولوی عبد القادر بی اے کا انتخاب عمل میں آیا۔[۱۴]

عالمِ عرب میں شہرت

مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کے بقول مولانا حمید الدین فراہی مختلف علوم خصوصاً علومِ قرآن میں ایسے یگانہ روزگار تھے کہ کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پاسکا۔ اسی طرح ان کے علم و فضل کی شہرت دور دراز ممالک مثلاً مصر، شام، حجاز نیز دوسرے اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔[۱۵]

۱۲۔ مکاتیب شبلی، ج ۲ بنام سلیمان ندوی، معارف پریس، خط ۱۷، اعظم گڑھ۔

۱۳۔ ''حیات سلیمان''، سید سلیمان ندوی معارف پریس اعظم گڑھ ص ۵۱۵۔

۱۴۔ ''حیات سلیمان''، سید سلیمان ندوی معارف پریس اعظم گڑھ ص ۲۸۲، ۲۸۳۔

۱۵۔ ''حیات سلیمان''، سید سلیمان ندوی معارف پریس اعظم گڑھ ص ۵۸۲، ۵۸۳۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جب مولانا کی کتاب ''اقسام القرآن'' اور چند سورتوں کی تفسیر چھپی تو بقول سلیمان ندوی:

''اہلِ علم نے ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ علامہ سید رشید رضا صاحب ''المنار''، مصر، جو خود تفسیر لکھ رہے تھے، انھوں نے ان پر مداحانہ اور معترفانہ تقریظ لکھی اور تحسین کی۔'' (''یادِ رفتگان''، ص ۱۱۹)

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کی تحقیق کے مطابق یہ تقریظ مارچ ۱۹۰۹ کے ''المنار'' میں لکھی گئی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں مدینہ میں بین الاقوامی یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز ہوئی تو پڑھانے کے لیے جن علما کا نام تجویز ہوا ان میں علامہ شبلی اور مولانا فراہی کے نام بھی تھے۔[16]

جون ۱۹۲۷ میں جب مولانا فراہی نے حج کے لیے ارضِ مقدس کا سفر کیا تو آپ سے جن جید علما کی ملاقاتیں ہوئیں ان کے بارے میں مولانا شرف الدین اصلاحی لکھتے ہیں:

''حجاز میں مقامی علماء کے علاوہ تقی الدین ہلالی (مراکشی)، مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ مولانا سندھی نے اپنی مسندِ درس مولانا فراہی کے لیے خالی کر دی۔ مولانا فراہی کے درس میں مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم بھی شریک ہوتے تھے۔''[17]

علامہ تقی الدین ہلالی المراکشی بھی مولانا فراہی سے کسب فیض کرنے والوں میں شامل ہیں۔ مولانا ابو للیث اصلاحی ندوی جنھیں مولانا فراہی اور علامہ ہلالی کی شاگردی کا شرف حاصل رہا، لکھتے ہیں:

''دار العلوم ندوۃ العلما میں عربی ادب کے استاد علامہ تقی الدین ہلالی صاحب ۱۳۴۲ء میں ہندوستان آئے تو انھوں نے مولانا فراہی سے ملاقات کے لیے ان کے گاؤں کا سفر کیا۔ اس کے علاوہ شام، مصر حجاز، کے دوسرے بہت سے جلیل القدر علماء نے بھی ان سے ملاقاتیں کیں۔'' (ششماہی ''علوم القرآن'' جنوری۔ جون ۱۹۹۲، ص ۱۰۰۔ مضمون: ''مولانا فراہی .... حیات و خدمات''، مصنف: ابو اللیث ندوی)

علامہ تقیؒ الدین ہلالی کو مولانا فراہی سے جو عقیدت و تعلق تھا اس کا اظہار ان کی ذاتی ڈائری کے ان اوراق سے ہوتا ہے جن میں مولانا فراہی کے عادات و اطوار کے بارے میں تفصیل سے اپنے تاثرات قلم بند کیے تھے۔ ان تاثرات کو ان کے اپنے الفاظ میں مولانا ابو اللیث اصلاحی نے مشہور عربی مجلہ ''ایضاء'' الشہریہ لکھنو نومبر ۱۹۳۳ کے شمارہ میں یعنی مولانا کی وفات کے صرف تین سال بعد اپنے مضمون میں رقم کیا۔ جس کا ترجمہ علی

۱۶۔ ''ترجمان القرآن''..... مولانا فراہی ''معارف''، اعظم گڑھ فروری ۱۹۹۱، ص ۹۶، ۹۷۔

۱۷۔ ''ترجمان القرآن''..... مولانا فراہی ''معارف''، اعظم گڑھ فروری ۱۹۹۱، ص ۱۰۵۔

گڑھ کے ششماہی مجلہ ''علوم القرآن'' نے اپنی اشاعت جنوری جون ۱۹۹۲ میں شائع کیا۔ علامہ ہلالی لکھتے ہیں:

''وہ (مولانا فراہی) علما متقدمین کے اخلاق کے پر تو تھے۔ ان کے اندر اولیاء اللہ کی صفات نمایاں تھیں۔ انھیں دیکھ کر علماء، متقدمین کے فضل و کمال کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ ان کے اندر اولیاء اللہ کی خوش بو محسوس کی جا سکتی تھی۔'' (ص ۹۸)

مفسرین پر اثرات

مولانا فراہی کی علمی و فکری جدوجہد کا اصل مرکز قرآن اور تفسیرِ قرآن تھا۔ اس معاملے میں آپ نے برصغیر میں پہلے سے رائج تفسیری تصورات سے ہٹ کر منفرد راہ نکالی۔ لیکن یہ روش ایسی تھی جس کے کنارے لگے شجرہاے سایہ دار سے ہر بعد میں آنے والے مفسر نے خوشہ چینی ضرور کی۔ مولانا فراہی کے بعد اردو زبان میں چار ایسے مفسرین ہیں جنھیں علمی و عوامی سطح پر قبولیت حاصل ہوئی۔ یعنی مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، اور مولانا امین احسن اصلاحی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان چاروں مفسرین پر فکرِ فراہی کے واضح اثرات پائے جاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے مولانا فراہی سے جو استفادہ کیا اس کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس زمانہ (۱۹۰۵) میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوہ میں مقیم تھے اور ''الندوہ'' کے مددگار ایڈیٹر تھے۔ وہ مولانا حمید الدین صاحب کی ان صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے اور قرآنِ پاک کے درس و نظم کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے۔ اور بالآخر ''الہلال'' کے صفحات میں اس جادہ پیمائی کے مختلف مناظر سب کی نظروں کے سامنے آئے۔'' (یادِ رفتگان، ص ۱۲۰)

مولانا آزاد کو آپ سے علمی استفادے کا کتنا شوق تھا اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ڈاکٹر شرف الدین کی تحقیق کے مطابق مولانا فراہی ۱۹۲۴ء میں کلکتہ گئے تو وہاں مولانا حسین احمد مدنی کے پاس مسجدِ ناخدا میں قیام کیا یہیں مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کی ملاقات ہوئی۔ مولانا آزاد نے پھر یہاں آکر مولانا سے استفادہ کا پروگرام بنایا مگر وہ آنہ سکے۔[۱۸]

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی بھی ان کی فکرِ قرآنی سے متاثر تھے۔ ذیل کی تحریر سے اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ وہ مولانا فراہی کے طرزِ تفسیر کو کتنا پسند کرتے تھے۔

''سلسلۂ تفاسیر (فراہی) کی بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ اس کے جس جزو کو بھی پڑھیں گے وہ آپ کو صرف اس

۱۸۔ ماہنامہ ''معارف''، مضمون: ''ترجمان القرآن..... مولانا فراہی''، ص ۱۰۴، فروری ۱۹۹۱ اعظم گڑھ۔

سورہ کے معنی و مطلب سے ہی آشنا نہ کرے گا، جس کی تفسیر اس جزو میں کی گئی ہو بلکہ اس کے ساتھ ہی پورے قرآن کو سمجھنے کے لیے آپ کو بہت سی اصولی معلومات بھی دے گا، تحقیق کے نئے راستے دکھائے گا، تدبر فی القرآن کے نئے نئے دروازے کھولے گا۔'' (ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' ج ۱۹، عدد ۴، ۵، ۶)

عبد الماجد دریا آبادی بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے مولانا فراہی کے اثرات قبول کیے:

''اس دور (۱۹۱۹ سے پہلے) دو یا تین زندہ ہستیاں بھی ایسی تھیں جن سے طبیعت رفتہ رفتہ اور بہت تدریجی ارتقاء سے سہی، لیکن بہر حال اصلاحی اثر قبول کرتی رہی، ایک اردو کے مشہور حکیم و ظریف شاعر اکبر الٰہ آبادی ہیں، دوسرے ''کامریڈ'' کے ایڈیٹر اس وقت کے مسٹر اور اس درمیان میں مولانا ہو جانے والے محمد علی، ان دو کے بعد ہلکا ہلکا اثر مولانا حمید الدین مفسرِ قرآن کا بھی پڑتا رہا۔''

(''مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں''، مولانا محمد عمران ندوی ص ۲۵، مجلسِ نشریات اسلام کراچی)

مولانا امین احسن اصلاحی ''تدبرِ قرآن'' میں جگہ جگہ مولانا فراہی کے فکرِ قرآنی کے حق میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی ساری تفسیری کاوش کو مولانا کی تعلیم و تربیت ہی کا ثمرہ قرار دیتے ہیں۔ صرف ایک اقتباس ہی اس کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''میری چالیس سال کی محنتوں کے نتائج کے ساتھ ساتھ اس میں میرے استاذ حمید الدین فراہی کی تیس پینتیس سال کی کوششوں کے ثمرات بھی ہیں مجھے بڑا فخر ہوتا اگر میں یہ دعویٰ کر سکتا کہ اس کتاب میں جو کچھ بھی ہے سب استاذ مرحوم ہی کا افادہ ہے۔ اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے لیکن میں یہ دعویٰ کرنے میں صرف اس لیے احتیاط کرتا ہوں کہ مبادا میری کوئی غلطی ان کی طرف منسوب ہو جائے۔ مولانا رحمہ اللہ سے میرے استفادے کی شکل یہ نہیں رہی ہے کہ ہر آیت سے متعلق یقین کے ساتھ ان کی رائے میرے علم میں آ گئی ہو بلکہ میں نے ان سے قرآنِ حکیم پر غور کرنے کے اصول سیکھے ہیں اور خود ان کی رہنمائی میں پورے پانچ سال ان اصولوں کا تجربہ کرنے میں بسر کیے ہیں۔ پھر انھی اصولوں کو سامنے رکھ کر آج تک کام کر رہا ہوں۔ اس اعتبار سے اگرچہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ یہ سب کچھ استاذ رحمہ اللہ ہی کا فیض ہے، لیکن اس میں چونکہ بلاواسطہ افادے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ افادے کا بھی بہت بڑا حصہ ہے، اس وجہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اس کا جو حصہ مستحکم اور مدلل نظر آئے اس کو استاذ مرحوم کا صدقہ سمجھیے۔ اور جو بات کمزور یا غلط نظر آئے اس کو میری کم علمی پر محمول فرمائیے۔'' (مقدمہ ''تدبرِ قرآن''، ج ۱ ص ۴۱، فاران فاؤنڈیشن لاہور)

محمد رفیع مفتی

قارئین ''اشراق'' کے خطوط و
سوالات پر مبنی جوابات کا سلسلہ

تقدیر اور دعا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سوال: اگر تقدیر پہلے سے طے شدہ ہے، تو پھر دعا کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: دعا کرنے والا اللہ سے جو مانگنا چاہتا ہے، مانگتا ہے۔ اللہ اگر اپنی حکمت کے ساتھ چاہتا ہے، تو اُس کی دعا قبول کر لیتا ہے اور اُسے اُس کے مانگنے کے نتیجے میں وہ کچھ عطا کر دیتا ہے جو اُس شخص نے مانگا ہو۔

آپ جس بات کو اِس کے ساتھ 'Confuse' کر رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ شاید کسی 'Dictated' یا پہلے سے اپنے طے شدہ پروگرام کے تحت چل رہا ہے اور اُس طے شدہ پروگرام میں ظاہر ہے یہ تو لکھا ہوا نہیں ہو گا کہ فلاں آدمی نے خدا سے ایک دعا بھی کرنی ہے۔ چنانچہ جب وہ آدمی دعا کرتا ہے تو خدا کے لیے یہ مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اُس کی دعا کی طرف دھیان دے تو وہ 'Dictation' یا طے شدہ پروگرام مجروح ہوتا ہے اور اگر دھیان نہ دے تو پھر بندے کا خدا سے دعا کرنا ایک بے کار عمل ٹھیرتا ہے۔ نہیں، بات ایسے نہیں ہے۔

خدا اصلاً، پہلے سے کسی طے شدہ پروگرام کے تحت نہیں چل رہا۔ بلکہ بات کچھ اِس طرح سے ہے کہ اُس نے کچھ اصولی فیصلے کیے ہوئے ہیں اور کچھ قوانین بنائے ہوئے ہیں۔ وہ اُن فیصلوں کی اور اُن قوانین کی پابندی ضرور کرتا ہے۔ مزید یہ ہے کہ اُس نے ہمارے لیے اپنی مرضی سے امتحان و آزمایش کی نوعیت کی بعض چیزیں طے کر رکھی ہیں۔ اور وہ اُن کے حوالے سے ہمیں آزما رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے یہ طے نہیں کیا کہ نیکی اور بدی میں سے کسی ایک کو ہم اپنی مرضی سے اختیار کر ہی نہ سکیں۔ بلکہ اِس کے برعکس اُس نے یہ طے کیا ہے کہ ہم لازماً نیکی اور بدی کو اپنی مرضی ہی سے اختیار کریں۔ لہٰذا، ہم اپنی مرضی سے نیکی کی طرف بڑھتے اور اپنی مرضی ہی سے

بُرائی کو اختیار کرتے ہیں۔

اِس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اللہ اپنے کمالِ علم کی بنا پر اور اپنے عالم الغیب ہونے کی بنا پر پہلے سے یہ جانتا ہے کہ مستقبل میں کس نے کیا کرنا ہے اور کس نے کیا نہیں کرنا۔

دعا یہ ہے کہ ہم کسی معاملے میں خدا سے مدد لیتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو اللہ ہماری دعا کو بعض اوقات قبول کر لیتا ہے اور بعض اوقات نہیں۔ جب وہ ہماری دعا کو قبول کرتا ہے، تو اِس سے خدا کے علمِ کامل کے حوالے سے کوئی نیا واقعہ رونما نہیں ہوتا، بلکہ یہ محض اُس کے علمِ کامل ہی کی تصدیق ہوتی ہے، جس میں یہ موجود تھا کہ فلاں آدمی اپنے اختیار و ارادہ سے خدا سے دعا کرے گا اور اُس کے دعا کرنے کے نتیجے میں اللہ اُسے فلاں شے عطا کر دے گا۔

مختصراً یہ ہے کہ اللہ کا علمِ کامل اور چیز ہے اور اللہ کے طے شدہ اصول و قوانین اور امتحان کی غرض سے طے شدہ آزمایشیں اور چیز ہیں۔ علمِ کامل میں اضافہ محال ہے اور امتحان کی غرض سے پہلے سے طے شدہ آزمایشوں، نعمتوں اور مصیبتوں میں کمی یا اضافہ ممکن ہے اور یہ ہوتا رہتا ہے۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو بہت سی دعائیں دراصل خدا سے آزمایش کی تبدیلی کی دعائیں ہوتی ہیں، آدمی اِس طرح کے الفاظ تو نہیں بولتا لیکن بات نتیجے کے اعتبار سے ہوتی یہی ہے کہ ہمیں آفت کے ذریعے سے آزمانے کے بجائے نعمت کے ذریعہ سے آزمایا جائے۔ چنانچہ اللہ کی حکمت میں اگر آزمایش کی یہ تبدیلی موزوں ہوتی ہے تو اللہ دعا قبول کر لیتے ہیں، ورنہ نہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

قارئین ''اشراق'' کے خطوط و
سوالات پر مبنی جوابات کا سلسلہ

کافر اور غیر مسلم

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوال: اہلِ کتاب کو کافر کہنا درست ہے یا نہیں ؟ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی آیت ۷۲ میں عیسائیوں کے عقیدہ کو کفر سے تعبیر کیا ہے ؟ (محمد صفتین، راولپنڈی)

جواب: کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے۔ پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے۔ یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اب ہمارا کام یہی ہے کہ ہم مختلف گروہوں کے عمل و عقیدہ کی غلطی واضح کریں اور جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو نہیں مانتے انھیں بس غیر مسلم سمجھیں اور ان کے کفر کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔

وتر

سوال: آپ کی رائے میں وتر نمازِ تہجد ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی دو سنتوں (نوافل) اور وتر کی نماز پر اتنا زور کیوں دیا ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ کیوں فرمایا کہ وتر کی نماز پڑھ کر سونا؟ (محمد صفتین، راولپنڈی)

جواب: وتر تہجد ہے اور اس کی حیثیت ایک نفل نماز کی ہے اس نماز کا اصل وقت طلوعِ فجر سے پہلے کا ہے۔ البتہ اس کے بارے میں اجازت ہے کہ اگر اس وقت اٹھ کر پڑھنا ممکن نہ ہو تو عشا کے ساتھ پڑھ لی

جائے۔ بعض نفل نمازیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی وجہ سے نبیِ کریم نے ان کی تاکید بھی کی ہے۔ تاکید سے ان نوافل کی قدر و قیمت واضح ہوتی ہے اور اس سے ان کا زیادہ باعثِ اجر ہونا معلوم ہوتا ہے۔

نکاح اور ولی کی رضامندی

سوال: ولی کی رضامندی کے بغیر نکاح ہو جاتا ہے یا نہیں؟ نابالغ لڑکے یا لڑکی کا نکاح ہو جاتا ہے یا نہیں؟ (محمد صفتین، راولپنڈی)

جواب: ایک عاقل و بالغ مرد اور عورت کے نکاح کے انعقاد کے لیے ولی کی رضامندی قانونی شرط کی حیثیت نہیں رکھتی، لیکن اگر ان کی رضامندی کے ساتھ ایسا ہو تو یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شادی کے نتیجے میں جو گھر وجود میں آتا ہے اس سے یہ قریبی عزیز شدید طور پر متعلق ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر وہ کسی نکاح پر راضی نہیں ہیں تو یہ چیز نئے جوڑے کے لیے مشکلات کا باعث بن سکتی ہے۔ اسی وجہ سے احادیث میں ولی کی رضامندی حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ نابالغ کا نکاح ہو جاتا ہے، لیکن جب وہ بالغ ہوں تو انھیں اس نکاح کے ختم کرنے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔

حبِ نبوی

سوال: کیا ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کے بھی مکلف ہیں۔ کیا اطاعت بلا محبت نفاق ہے؟ (محمد صفتین، راولپنڈی)

جواب: نبیِ کریم سے محبت آپ پر ایمان کا فطری تقاضا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم دوسرے تمام علائق سے اس تعلق کو ترجیح دیں اور آپ اور آپ کے دین پر آنچ نہ آنے دیں۔ اگر کوئی شخص اس محبت سے محروم ہے تو پھر اسے جائزہ لینا چاہیے کہ اس کا ایمان محض زبان کے اقرار تک تو محدود نہیں ہے؟

امن اور جنگ

سوال: اگر جنگ فیصلہ کن مرحلے میں ہو اور دشمن اپنے آپ کو بچانے اور مسلمانوں کو دھوکا دے

کر انھیں شکست دینے کے لیے صلح کا پیغام بھیجے تو کیا مسلمانوں کو اس پیغام کو قبول کر لینا چاہیے ؟ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم صلح کا پیغام قبول کر لو جبکہ اس کے برعکس سورۂ انفال آیت ۵۸ میں فرماتا ہے کہ "اگر تمھیں کسی قوم سے دغا بازی کا اندیشہ ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو۔" سورۂ انفال کی آیت ۶۱ میں اگلے اجزا میں ہے کہ "اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا رکھو۔" (محمد صفتین، راولپنڈی)

جواب: دینِ اسلام صلح اور امن کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا اور جنگ سے گریز کے طریقے ہی کو اختیار کیے رکھا۔ قرآنِ مجید کی جن آیات کا آپ نے حوالہ دیا ہے ان سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے۔ البتہ یہ ترجیح اسی شرط کے ساتھ ہے کہ اس سے امن حاصل ہو۔ اگر دشمن کی طرف سے اس کے پیچھے کوئی چال ہو تو اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر جنگ جاری رکھنا ناگزیر ہو تو جنگ جاری رکھی جائے گی۔ لیکن یہ فیصلہ محض اندیشے کی بنیاد پر نہیں ہونا چاہیے، اس کے پیچھے قوی دلائل ہونے چاہییں۔ سورۂ انفال کی آیت میں "اللہ پر بھروسا رکھو" کے الفاظ محض اندیشوں کی بنا پر امن سے گریز سے روکنے ہی کے لیے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خروج اور اقتدار

سوال: کیا جہاد کی طرح خروج کے لیے بھی اقتدار شرط ہے؟ (محمد صفتین، راولپنڈی)

جواب: خروج سے مراد یہ ہے کہ کسی اقتدار پر فائز گروہ کو بزورِ بازو اقتدار سے الگ کر دیا جائے اور اس کی جگہ خود اقتدار سنبھال لیا جائے۔ ظاہر ہے یہ راستہ اسی جگہ اختیار کیا جائے گا جہاں انتقالِ اقتدار کی کوئی پر امن صورت اختیار نہ کی جا سکتی ہو۔ یہ عمل اگر دین کی خاطر کیا جا رہا ہو تو یہ جنگ جہاد ہی ہو گی۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک انبیا کے طریقِ کار سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خروج کی صورت میں بھی جہاد کے لیے لگائی گئی اقتدار کی شرط قائم رہے گی۔ یعنی اس گروہ کو پہلے کسی خطے میں خود مختار حکومت قائم کرنا پڑے گی۔ اس کے بعد ہی وہ جنگ کر سکے گا۔ واضح رہے کہ خروج کی بنیادی شرائط کے مطابق لازم ہے کہ جس گروہ کے خلاف خروج کیا جا رہا ہو اس نے استبدادی نظام قائم کر رکھا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ قرآنِ مجید کی صریح نصوص سے انحراف کا مرتکب ہوا ہو۔ تیسرے یہ کہ جو گروہ خروج کے لیے نکلے اس کی پشت پر قوم کی غالب اکثریت

ہو۔اور جنگ سے پہلے لازم ہے کہ اس گروہ نے پہلے کسی خطے میں اپنی آزاد ریاست قائم کر لی ہو۔

مہر کی ادائیگی

سوال: آپ کی رائے میں مہر کا نکاح کے وقت ادا کرنا ضروری نہیں۔ حالانکہ یہ عورت کا حق اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کی بروقت ادائیگی کا کہا گیا ہے؟

(محمد صفتین، راولپنڈی)

جواب: مہر کو نکاح کے موقع پر ادا کرنا ہی اولیٰ ہے۔ اس کی ادائیگی کو اس موقع پر لازم کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ بسا اوقات حقیقی اسباب کے تحت اس کا اس موقع پر ادا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ شاید اسی وجہ سے اس کی ادائیگی کو کسی وقت کے ساتھ مشروط نہیں کیا گیا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ نکاح کے وقت اسے ادا کرنا، اس کے لیے موزوں ترین وقت ہے اور اس موقع پر ادا کرنے سے اس کی غایت پوری ہوتی ہے۔ اس کی ادائیگی میں تاخیر کی جو رخصت دی گئی ہے، اس سے واقعی کوئی مشکل درپیش ہو تو فائدہ اٹھانا چاہیے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خیال و خامہ

جاوید

O

امن کا نام لبوں پر ہے ، سناں پہلو میں
اک زباں منہ میں ہے اور ایک زباں پہلو میں

اب تو لگتا ہے کہ تہذیب کا حاصل ہے یہی
ہاتھ میں جام ، کوئی حورِ جناں پہلو میں

قافلہ ہے، نہ جرس ، گرمِ سفر ہوں پھر بھی
ساتھ چلتی ہے تو اک ریگِ رواں پہلو میں

سیر دیکھیں گے ، ذرا دیر کو آئے تھے، مگر
دل نہیں ، یہ تو نکل آیا جہاں پہلو میں

یوں تو قرآن بھی ہے خانقھوں کی زینت
ساتھ رہتا ہے، مگر سرِّ نہاں پہلو میں

اِسی امید پہ کھویا تھا کہ پا لیں گے اِسے
دل نے چھوڑا نہ کوئی اپنا نشاں پہلو میں

لوٹ آتی ہے، نوا ہو کہ فغاں ہو میری
یہ ترا دل ہے کہ اک سنگِ گراں پہلو میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معظم صفدر

اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۰۰ء

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآنیات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	البقرۃ(۲:۶۷-۷۳)	جاوید احمد غامدی	۷
فروری	البقرۃ(۲:۷۴-۸۲)	〃	۷
مارچ	البقرۃ(۲:۸۳-۸۶)	〃	۹
اپریل	البقرۃ(۲:۸۷-۹۰)	〃	۷
مئی	البقرۃ(۲:۹۱-۹۶)	〃	۹
جون	البقرۃ(۲:۹۷-۱۰۰)	〃	۱۳
جولائی	البقرۃ(۲:۱۰۱-۱۰۳)	〃	۱۱
اگست	البقرۃ(۲:۱۰۴-۱۰۷)	〃	۱۳
ستمبر	البقرۃ(۲:۱۰۸-۱۱۳)	〃	۱۳
اکتوبر	البقرۃ(۲:۱۱۴-۱۲۱)	〃	۷
نومبر	البقرۃ(۲:۱۲۲-۱۲۵)	〃	۹
دسمبر	البقرۃ(۲:۱۲۶-۱۳۲)	〃	۱۱

معارف نبوی

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	صحابہ کے لیے بشارت، جنت کی کنجی، آخرت کی فکر	طالب محسن	۱۱
فروری	غلبۂ اسلام، جنت کی چابی	"	۱۳
مارچ	نیکی کا اجر، نیکی اور گناہ	"	۱۳
اپریل	دین اور کردار	"	۱۱
مئی	نجات کی خوش خبری، بہترین ایمان	"	۱۳
جون	بڑے گناہ، کبیرہ گناہ	"	۱۷
جولائی	مہلک جرائم، ایمان اور گناہ	"	۱۷
اگست	ایمان سے محرومی کی نوعیت، علامات نفاق،	"	۱۷
"	منافقت کی نشانیاں، منافق کی مثال		
ستمبر	یہودی سائل، مسلمانوں کا حق اور جہاد،	"	۱۷
"	ایمان کا سایہ		
اکتوبر	دس نصیحتیں	"	۱۳
نومبر	نفاق کا زمانہ، وسوسے پر معافی،	"	۱۵
"	تقدیر سے متعلق ایک حدیث کی وضاحت	محمد رفیع مفتی	۲۰
دسمبر	خیالات، غلط سوال، سوال کا جواب	طالب محسن	۱۹

مناجات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
فروری	آغاز سفر پر اذکار	ساجد حمید	۱۸
مارچ	آغاز سفر پر اذکار (۲)	"	۲۱

دین و دانش

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	قانون سیاست (۱)	جاوید احمد غامدی	۲۳

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	پاک وہند میں قرآن مجید کے فارسی تراجم	محمد سلیم خالد	۳۲
"	غیر مسلم حکومت میں مسلم اقلیت کا دعوتی کردار	سید وضی مظہر ندوی	۴۰
فروری	قانون سیاست (۲)	جاوید احمد غامدی	۲۱
"	خورونوش میں حلت وحرمت (۱)	"	۲۴
"	غیر مسلم حکومت میں مسلم اقلیت کا دعوتی کردار (۲)	سید وضی مظہر ندوی	۲۷
مارچ	قانون سیاست (۳)	جاوید احمد غامدی	۲۳
"	خورونوش میں حلت وحرمت (۲)	جاوید احمد غامدی	۲۵
اپریل	مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کی علمی خدمت	خالد مسعود	۲۱
"	قانون سیاست (۴)	جاوید احمد غامدی	۴۱
"	آداب وشعائر (۱)	"	۴۷
مئی	قانون سیاست (۵)	جاوید احمد غامدی	۱۷
"	آداب وشعائر (۲)	"	۳۶
"	تصویر (۱)	محمد رفیع مفتی	۴۲
جون	تہذیبوں کا تصادم اور اسلام	جاوید احمد غامدی	۲۵
"	تصویر (۲)	محمد رفیع مفتی	۳۳
"	حضرت ابراہیم کے والد کا نام: آزر یا تارخ	عبدالستار غوری	۴۱
جولائی	تصویر (۳)	محمد رفیع مفتی	۲۵
"	جہاد: ایک تنقید کا جواب	منظور الحسن	۴۶
اگست	آداب وشعائر (۳)	جاوید احمد غامدی	۲۷
"	تصویر (۴)	محمد رفیع مفتی	۳۰
"	اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت	جاوید احمد غامدی/منظور الحسن	۴۳
"	قسم اور کفارۂ قسم کے احکام	محمد وسیم اختر مفتی	۴۷

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
ستمبر	آداب وشعائر (۴)	جاوید احمد غامدی	۲۵
؍	تصویر (۵)	محمد رفیع مفتی	۲۸
؍	حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کی حقیقت	محمد مشتاق احمد	۳۶
اکتوبر	قسم اور کفارۂ قسم	جاوید احمد غامدی	۲۱
؍	تصویر (۶)	محمد رفیع مفتی	۲۴
نومبر	قانون جہاد (۱)	جاوید احمد غامدی	۳۱
؍	سبعۃ احرف	محمد اسلم نجمی	۳۴
؍	عالم برزخ	جاوید احمد غامدی/منظور الحسن	۴۵
دسمبر	قانون جہاد (۲)	جاوید احمد غامدی	۲۷
؍	روزہ	جاوید احمد غامدی/منظور الحسن	۳۰
؍	مولانا حمید الدین فراہی کا علمی مقام: مشاہیر کی نظر میں	اختر حسین عزمی	۴۱

شذرات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	امید ہے اس عید پر.....	محمد بلال	۵
فروری	مسلمان دین مساوات کو ماننے کے باوجود.....	؍	۵
مارچ	ہم کیسی قربانی کر رہے ہیں جس کا.....	؍	۶
؍	''اشراق'' کا اصلاح و دعوت ایڈیشن	طالب محسن	۵
اپریل	صالحین اٹھیں، آگے بڑھیں اور.....	محمد بلال	۲
مئی	خواتین کا دن منایا جاتا رہے گا مگر.....	؍	۲
جون	عرس، تصوف اور اسلام	؍	۲
؍	قحط، بے حسی اور ظلم	؍	۱۱
اگست	ختم نبوت اور ہمارا رویہ	؍	۲
؍	''میلاد کارڈ'' اور ''کرسمس کارڈ''	؍	۴

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
اگست	میل ملاپ کی اہمیت	محمد بلال	۶
"	حادثے کا پیغام	منظور الحسن	۸
ستمبر	ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اپیل	"	۲
"	جمہوریت اور اصلاح معاشرہ	محمد بلال	۶
اکتوبر	غیرت اور قتل	"	۲
نومبر	"قائد اعظم محمد علی جناح" کی ضرورت	"	۲
"	مہنگی کتابیں یا سستا ذوق	"	۲
دسمبر	رمضان اور جذبات کا ہیجان	"	۲
"	آیئے، ماضی میں چلیں!	"	۴
"	امام امین احسن اصلاحی کی یاد میں	محمد اسلم نجمی	۸

اصلاح و دعوت

اگست	حسن کارکردگی	طالب محسن	۵۵
"	صبر	"	۵۶
"	اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی	منظور الحسن	۵۸

مکاتیب

مارچ	مکتوب (۱)	کریم الدین/جاوید احمد غامدی	۳۵
"	مکتوب (۲)	محمد موسیٰ بھٹو/جاوید احمد غامدی	۴۴
اپریل	مکتوب (۱)	سعید انور/جاوید احمد غامدی	۵۱
"	مکتوب (۲)	محمد اکرم/جاوید احمد غامدی	۵۲
"	مکتوب (۳)	ولی محمد/جاوید احمد غامدی	۵۳

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
اپریل	مکتوب(۴)	ظفر اقبال احمد/جاوید احمد غامدی	۵۴

یسئلون

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	متفرق سوالات	طالب محسن	۴۷
فروری	متفرق سوالات	〃	۵۳
مارچ	سوال وجواب	〃	۴۷
اپریل	سوال وجواب	〃	۵۷
جولائی	ٹیلی ویژن کے مضر اثرات، ڈش ایٹینا پر پابندی، ڈش اینٹینا کا تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال، صحیح مسالک، کسی کو کافر قرار دینا	جاوید احمد غامدی/منظور الحسن	۶۱
اگست	متفرق سوالات	جاوید احمد غامدی/منظور الحسن	۶۱
〃	متفرق سوالات	طالب محسن	۶۵
ستمبر	پل صراط، زکوٰۃ کے مسائل، قومی ترقی میں عورت کا کردار، عقل کا استعمال	〃	۲۹
دسمبر	تقدیر اور دعا	محمد رفیع مفتی	۵۳

تبصرۂ کتب

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
جنوری	''اقوال حکمت''	محمد بلال	۶۱
〃	''دعوت ایمان''	طالب محسن	۶۴
مارچ	''المیۂ تاریخ''	〃	۵۱
اکتوبر	''قول فیصل''	منظور الحسن	۵۴

وفیات

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
فروری	ایک ''سعادت مند خادم'' کی رحلت	محمد بلال	۵۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
مارچ	''نور بصیرت''عام کرنے والے کی رحلت(۱)	؍	۵۳
؍	ایک علمی روایت کا خاتمہ	خورشید ندیم	۵۶
مئی	''نور بصیرت''عام کرنے والے کی رحلت(۲)	محمد بلال	۵۷

نقطۂ نظر

جولائی	''مسائل نظر میں الجھ گیا ہے خطیب''پر ایک نظر	خورشید ندیم	۶۵
اگست	ایک حدیث کی تحقیق	ابو سلمان سراج الاسلام حنیف	۶۷

ادبیات

جنوری	حمد رب ذوالجلال	ضیاءالدین نعیم	۶۷
؍	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۸
فروری	غزل	؍	۷۲
مارچ	میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں!(سفر نامہ-۱)	محمد بلال	۶۱
؍	حمد رب ذوالمنن	ضیاءالدین نعیم	۷۰
؍	مریم کے نام(نظم)	جاوید احمد غامدی	۷۱
اپریل	میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں!(سفر نامہ-۲)	محمد بلال	۶۴
؍	غزل	جاوید احمد غامدی	۷۰
مئی	غزل	؍	۷۹
جون	غزل	؍	۶۷
جولائی	ندیم(نظم)	؍	۶۸
اگست	غزل	؍	۷۱
ستمبر	میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں!(سفر نامہ-۳)	محمد بلال	۶۱
؍	رازداں(نظم)	جاوید احمد غامدی	۶۷

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
اکتوبر	میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں! (سفر نامہ-۴)	محمد بلال	٦١
"	غزل	جاوید احمد غامدی	٦٧
نومبر	میں حاضر ہوں! میں حاضر ہوں! (سفر نامہ-۵)	محمد بلال	٦٣
"	غزل	جاوید احمد غامدی	٦٧
دسمبر	غزل	"	۵۸

اشاریہ

شمارہ	عنوان	مصنف	صفحہ
دسمبر	اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ٢٠٠٠ء	معظم صفدر	٦١

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com